باڑھ
شمشاد احمد

باڑھ

اور دوسرے افسانے

شمشاد احمد

نام کتاب	:	باڑھ
مصنف	:	شمشاد احمد
طبع اول	:	۲۰۰۰
سرورق	:	فردوس حیدر
قیمت	:	۱۲۰ روپے
پرنٹر	:	اے۔ٹی۔سی پرنٹرز
	:	

سویرا پبلی کیشنز

56۔این۔بلاک 6
پی۔ای۔سی۔ایچ۔ایس
کراچی۔

انتساب

طلعت کے نام

جس نے مجھے دیئے کو نئی روشنی دی

فہرست

بلڈوزر

نوردین مسجد سے نکلا تو ہوا پر چل رہا تھا۔

تاریکی کا غلاف جگہ جگہ سے پھسک رہا تھا۔ درختوں کے خدوخال نکھرنے لگے تھے۔ آتشی پھولوں میں سمٹے گل مہر کی شاخوں میں پرندوں نے چلبلانا شروع کر دیا تھا۔

نوردین نے منہ پر الٹا ہاتھ رکھ کر طویل، مطمئن جمائی کو تھپکی دی اور پھر عادتاً اپنی بلیک اینڈ وائٹ داڑھی پر بھی ہاتھ پھیر ڈالا۔

"مولا قربان جاؤں۔ کیا دنیا بنائی ہے! درخت اور پرندے نہ ہوتے تو بڑی کمی رہ جاتی۔"

نوردین نے ریلوے لائن پار کرنے سے پہلے دونوں طرف اچٹتی نظر ڈالی۔

'شکر ہے۔۔ اس وقت کسی گاڑی کا ٹائم نہیں ورنہ۔۔۔۔۔۔'

اسے کرخت آوازوں سے ہمیشہ سے چڑ تھی اور حالات نے اسے عمر بھر کے لئے مسلسل بھدی کھٹ پٹ میں لا ڈالا تھا۔

وہ جاتے میں باہر سے تالا لگا گیا تھا۔ ٹھنڈے تالے کو کھولتے ہوئے اسے ہنسی آگئی۔

شہروں میں انسانوں تک کو تالے لگ جاتے ہیں۔۔۔اس کے باوجود ان کے اندر کا انسان چپکے چپکے چوری ہوتا رہتا ہے اور انہیں احساس تک نہیں ہوتا۔'

اندر اس کے بیوی بچے ابھی بکھرے ہوئے پڑے تھا۔

'غافل لوگ۔۔ خوبصورت لمحات میٹھی پھوار کی مانند برس رہے ہیں اور یہ ۔۔۔۔۔'

نور دین مال گاڑی کے لمبے ڈبے نما کمرے سے ہوتا ہوا' صحن سے گزر کر' پچھلے دروازے کی چٹخنی گراتا باہر نکل آیا۔

اس کے چہرے پر پھول کھل رہے تھے۔

وہ پپیتے کے درخت کے پاس رک گیا۔ اس نے جھک کر جڑ سے اوپر تک چومتی آنکھیں پھیریں۔ ننھے ننھے زمرد ایک دوسرے کو بھینچے شبنم کی نمی پر سر رکھے سو رہے تھے۔

شدت جذبات سے نور دین کو جھرجھری آگئی۔

اس نے کھردرے تنے پر انتہائی تقدس سے ہاتھ پھیرا۔

'پہلا پہلا پھل ہے۔۔ ایک ایک دانہ سہی۔۔ ساری کالونی میں ہر گھر کا حصہ پہنچے گا۔'

پھر وہ نشے میں گنگناتا رات کی رانی کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

"شروع میں نئی نویلی دلہن کیسے لجائی لجائی رہی۔۔ ہر کس کو نامحرم جان کر سمٹی سمٹی رہتی تھی اور اب۔۔ پھولوں میں لدی مسکرائے چلی جا رہی ہے۔ اٹھلاتی خوشبو رات تو رات دن میں بھی اسکے اوپر منڈلاتی رہتی ہے۔۔ جنت میں رات کی رانی ضرور ہو گی"۔

نور دین اٹھ کھڑا ہوا۔ چمپا اسے کچھ ناراض سا لگا۔

'ناں۔۔ ناں۔۔ تم کسی سے کم نہیں۔۔۔ پورے جوان مرد۔۔۔ کیا سینہ تانے کھڑے ہو!'

نور دین کے اندر' اس کی رگ رگ میں پھلجڑیاں پھوٹ رہی تھیں۔

گلاب کی دو کلیاں ایک دوسرے میں ہونٹ پیوست کئے بس اب ذرا دیر میں جاگنے

کو تھیں۔

نور دین نے اپنا چہرہ اجلے آسمان کی طرف اٹھا دیا۔

"مولا۔۔۔بس۔۔۔اب اٹھا لے۔۔۔زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔"

دور چڑیوں کے نغمے نکلتی، صبح کے مقدس اجالے میں دھول گھولتی ریل دندناتی بھاگی چلی آ رہی تھی۔

نور دین نے جلدی سے دونوں کانوں میں انگلیاں بھر لیں اور آنکھیں اندھی کر لیں۔

ریل زمین کو، درختوں پرندوں کو، کوارٹر کو اور خود اس کو سر سے پیر تک جھنجھوڑ کر گزر گئی۔ نور دین اداس آنکھوں سے اسے دھندے افق میں غرق ہوتے دیکھتا رہا۔

"ابھی تھوڑی دیر میں شیطان کی آنت سے کہیں لمبی مال گاڑی دھت دھت کرتی گزرے گی۔ پھر وحشی اپر ایکس۔ تڑاتڑ۔۔۔پھر۔۔۔'

پودوں پر ست مہین دھول کا عذاب اتر رہا تھا۔ خوشبوؤں اور رنگوں کے چہرے کملانے لگے تھے۔

نور دین نے زور دار دھکے سے ٹین کے دروازے کو اندر دھکیلا اور واپس اپنے کوارٹر کے اکلوتے کمرے میں لوٹ آیا۔

مٹی کے تیل کے کثیف بخارات سے کمرہ کبڑہ ہو رہا تھا۔

اسکی بیوی بچوں کو فرسٹریشن کے سخت، بے رحم ہاتھوں سے جھنجھوڑ جھنجوڑ، کھینچ کھینچ کر جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔

نور دین نے اپنے اندر کے ملبے سے ایک نرم مسکراہٹ نکالی اور بیوی کو پیش کی۔

"ذرا تحمل سے بھلی لوگ۔۔۔یہ میرے تمہارے ذاتی بچے ہیں۔"

بیوی نے اس کی طرف دیکھے بغیر اپنا کام جاری رکھا۔

"مل آئے اپنے پیارے اللہ ماروں سے۔۔۔تمہارے بچے تو۔۔۔"

نور دین نے قہقہہ لگانے کی کوشش کی۔ وہ اکثر اپنی تلخیوں کو قہقہوں کے نشہ میں

چھپا لیتا تھا۔

کبھی کبھی نوردین کو اپنی گرفت بیوی اچھی خاصی بری لگنے لگی تھی اسے دکھ تھا کہ اسکی وجہ سے اس کے بچے بھی کھردرے ہوتے جارہے ہیں۔ وہ چیخ چیخ کر گنواروں کی طرح بات کرتے ہیں اور اکثر گالی گلوچ پر اتر آتے ہیں اور ادب آداب سے قطعاً ناآشنا ہیں۔

نوردین نے سر سے پرنا کھول دیا اور بلا ضرورت سر کھجانے لگا۔

"مولا۔ تیری کوئی مصلحت ہی ہوگی۔۔ اچھی بھلی کو کتی کوئل دیکھتے ہی دیکھتے کوے میں بدل گئی ہے"

اس نے لمبی ٹھنڈی سانس کو کھلا چھوڑ دیا۔

اس کی بیوی اب فرش پر بکھرے بے رونق گدے تہہ کررہی تھی اور اس کا چہرہ خود پرانے گدے کی طرح ہو رہا تھا۔

مٹی کے تیل کی بو سے نوردین کا جی متلانے لگا۔۔ اس سے نہ رہا گیا۔

"چولہا بیکار جل رہا ہے۔"

بیوی نے گدا اٹھایا اور پیٹی پر دے مارا۔۔ پھر ایک اچٹتی نظر میں نوردین کو پورے کا پورا کچا کھا گئی۔

"کلفٹن، ڈیفنس کے کس بنگلے میں جارہو۔۔ یہ ریلوے کالونی کا کوارٹر ہے۔"

نوردین پہلو بدل کر چھت کی دھمک کھائی لکڑیاں گننے لگا۔

بیوی نے مٹی کے مٹکے سے چائے کی کیتلی میں پانی انڈیلا اور کیتلی چولہے پر جھونک دی۔

اچانک ایک اجنبی آواز کوارٹر کے اندر کا تناہوا سناٹا درہم برہم کر دیا۔

پھٹ پھٹ۔۔۔ پھٹ پھٹ۔۔ گھوں گھوں۔۔ گھوں۔۔۔

نوردین کڑیوں کی گنتی بھول گیا۔

'ریل! نہیں۔۔۔ اس وقت کونسی گاڑی۔۔۔؟'

دھڑ۔۔۔ دھڑ۔۔۔ دھڑام۔۔۔ پھٹ پھٹ۔۔۔ گھوں گھوں۔

کمرہ بری طرح سے لرزنے لگا تھا۔

نوردین لپک کر دروازے کی طرف بڑھا۔

اس کی بیوی چلائی۔

"ناشتہ کر جاؤ۔ واپسی پر ہری مرچ بھی نہ ملے گی۔۔۔ تم اور تمہاری بھوکی اولاد۔۔۔"

"تم بچوں کو ناشتہ دو۔۔۔ میں ابھی آیا۔"

کوارٹروں کے پچھلے دروازے چیں چاں کھل رہے تھے۔۔۔ پرندے درختوں کی بجائے فضا میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔

ریلوے لائن کے ساتھ ایک مجمع جمع تھا اور اس میں بدستور اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔

ایک بھدی گڑگڑاہٹ نے اس کے پاؤں روکنے کی کوشش کی۔۔ لیکن وہ رکا نہیں۔

بل ڈوزر بھوکے دیو کی طرح آدم زاد آدم زاد ڈکراتا تیزی سے بڑھتا چلا آرہا تھا۔

کوارٹروں کے پچھواڑے چھوٹی چھوٹی چاردیواریوں کے ٹوٹے بلاک 'رسی پر لٹکے رنگ برنگے کپڑے 'ان میں الجھی ہوئی بان کی چارپائی 'ایک میلی تین ٹانگوں والی نواڑی کرسی اور ڈھیروں ملبہ بل ڈوزر کی جھولی میں کسمارہا تھا۔۔

نوردین بلبلا اٹھا۔

یہ صدیوں کا بھوکا شیطان ابھی چند لموں میں ہر شے کھا جائیگا۔ میرے پودے ۔۔۔۔۔ میں نے کوئی چاردیواری نہیں بنائی۔۔۔ سرکاری زمین نہیں ماری۔۔۔۔ میں نے تو بنجر ' بیکار زمین کی پرورش کی ہے۔

پھر اس کا ذہن قانونی موشگافیوں میں رینگنے لگا۔

سرکاری کوارٹر ہیں کوئی نوٹس نہ اطلاع۔۔۔۔

وہ سر سے پاؤں تک ابلتا ہوا تیزی سے لپکا اور بل ڈوزر کے عین سامنے جا کھڑا ہوا۔

بل ڈوزر رکا نہیں کرتے۔ بلڈوزر بڑھتا چلا آرہا تھا۔

بالکل اس جیسے مسکین ملازمین حکمرانی کے نیزے برساتے اس کی طرف لپکے' پولیس کے دو سپاہی بندوقیں جھلاتے ان کی مدد کو آپہنچے۔

نوردین کو بے رحمی سے دھکیل کر بل ڈوزر کے راستے سے ہٹادیا گیا۔

بلڈوزر چلتا رہا۔

اسے چار آدمیوں نے جکڑ رکھا تھا اور وہ ان کی سخت گرفت میں تڑپ رہا تھا۔

بل ڈوزر کے پھن نے سب سے پہلے پپیتے کو ڈسا۔ دھوئیں کی ایک لمبی ڈکار لی اور رات کی رانی کو ہڑپ کر گیا' چمپا مٹی دینے سے خود ہی لمبا لیٹ گیا۔ اور گلاب۔ دو نوزائیدہ کلیاں۔ نوردین نے آنکھیں اندھی کرلیں۔

اس کے اندر سے چیخوں کا ابلتا ہوا گرم لاوا پھوٹ پڑا۔

تماشائیوں کو نوردین کا پاگل پن عجیب بھی لگا اور دلچسپ بھی۔۔ اس کے اڑوس پڑوس والے اسے حیرت اور افسوس سے تکے جارہے تھے۔

'نوردین اتنی سی بات پر ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے! وہ تو بڑا سنجیدہ اور بردبار انسان ہوا کرتا تھا۔'

نوردین نے اپنے اردگرد بے نور آنکھیں پڑھ لیں اور اپنا دکھ اپنے اندر سمیٹ لیا۔

اسے ٹھیک ٹھاک دیکھ کر پکڑنے والوں نے گرفت ڈھیلی کردی۔ نوردین پھسل کر الگ ہو گیا اور پ تیزی سے اپنے گھر کی طرف لپکا۔

ٹین کے دروازے پر ہاتھی کی ٹانگ پڑی۔

کمرے میں سامنے ہی مٹی کا گھڑا رکھا تھا۔ نوردین نے اسے اٹھایا اور دیوار پر دے مارا۔ کمرے میں سیلاب آگیا۔

اسکی بیوی اس پر چیل کی مانند جھپٹی۔

"پانی۔۔۔پانی۔"

نوردین جھپ جھپ کرتا بیوی کی طرف لپکا۔۔ اسے پرانے بدبودار تکیے کی طرح جسم سے دور رکھ کر اٹھایا اور پیٹی پر رکھے گدوں اور لحافوں پر اچھال دیا۔۔ پھر وہ واپس پلٹا

اور ناشتے میں مصروف بچوں پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔

باہر بلڈوزر اپنا کام کر رہا تھا۔

کاروبار

شراب کا ایک دریا تھا جو میری رگوں میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور میرا ذہن اس میں ڈبکیاں کھا رہا تھا۔ ذرا دیر کو کوئی دریچہ کھلتا تو آس پاس کی دھندلی دھندلی جھلکیاں دکھائی دے جاتیں۔ پھر غلیظ تاریکی ہر چیز کو نگل لیتی۔

اس تاریکی میں مختلف آوازیں' ایک ملے جلے' مہمل شور کی طرح سنائی دیتیں۔ پھر اچانک ان آوازوں کا گلا گھٹ جاتا اور گونگی خاموشی ذہن کو جکڑ لیتی۔

جانے کب اور کس وقت ذہن پر لپٹی ہوئی دبیز سیاہ چادر میں ایک سوراخ نمودار ہوا۔ پھر یہ سوراخ آہستہ آہستہ بڑھنے لگا اور بڑھتے بڑھتے ایک گہرے غار کی شکل اختیار کر گیا۔

اس غار کے دہانے پر ایک ننھا سا انسانی ہیولا ابھرا۔ وہ مجھے گھورنے لگا' ہم دونوں آنکھوں میں آنکھیں ڈالے صدیوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔

پھر اچانک مجھے ایک حرکت کا احساس ہوا۔

انسانی ہیولا بڑھنے لگا۔ اوپر' اور اوپر۔ دیکھتے دیکھتے عام انسانی قد سے بھی اوپر نکل گیا۔

یہ شخص نہایت اطمینان اور لاپرواہی سے میرے ذہن کے وسیع وعریض جنگل میں چہل قدمی کرنے لگا۔

اس کے پاؤں کی ہر چاپ ایک زخم تھی اور میں لمحوں میں سراپا درد بن گیا۔

"یہ کون ہے جس کا وجود زخم ہے۔ درد ہے اور بے پناہ اذیت ہے؟"

میں نے درد اور اذیت کے گہرے سمندروں کی اتھاہ گہرائیوں سے اسے آواز دی۔

"تم کون ہو؟"

ٹہلتا ہوا سایہ رک گیا۔ میں نے چندھی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کا سفید لبادہ تیز ہوا میں پھڑ پھڑا رہا ہے۔

وہ پلٹا اور مجھے احساس ہوا کہ وہ اجنبی نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں میں نے کہیں دیکھی ہیں۔ اسکے چہرے پر جو بے بسی اور کرب ہے' اس سے میرا بھی کوئی رشتہ ہے۔

میں نے اسے پکارا۔۔۔۔۔

اس کے چہرے کی بے بسی اور کرب اچانک غائب ہو گئے۔ اب وہ مسکرا رہا تھا' ہلکی ہلکی، تھکی تھکی مسکراہٹ جس میں تیز نوکیلے نشتر تھے۔ یہ مسکراہٹ دلوں کو چھلنی کر دیتی ہے اور ذہن پر دہکتی ہوئی سرخ سلاخوں سے پھوکے لگاتی ہے۔

میں نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ پھیلایا۔

اس نے لمحہ بھر کی ہچکچاہٹ کے بعد میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس طرح جیسے کوئی غلاظت میں لتھڑی ہوئی کسی شے کو پکڑتا ہے۔ پھر مجھے ایک ہزاروں نوکوں والے پتھر پر بٹھا دیا۔

میں نے ایک بار پھر اپنی پھولی ہوئی زبان سے دوہرایا

"تم کون ہو؟ کیا ہو؟"

وہ خاموش رہا۔ پتھر کی طرح ساکن اور بے بس۔ لیکن اسکے چہرے پر جمی ہوئی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

پھر مجھے اپنے سارے سوالوں کا جواب خود ہی مل گیا۔ وہ مجھے گھورے جا رہا تھا۔

اسکی آنکھیں بول رہی تھیں۔۔۔اذیت اور کرب لاوے کی صورت میں ابل رہے تھے۔

دور۔۔۔بہت دور۔۔۔بہت پیچھے مجھے ان آنکھوں میں ہمدردی کی پرچھائیاں بھی نظر آرہی تھیں یا پھر میں نے خود ہی انہیں تخلیق کر لیا تھا۔

مجھے اس وقت ہمدردی کی ضرورت محسوس ہوئی' اتنی شدید اور اتنی زیادہ کہ اگر ساری کائنات ہمدردی کی ایک دبیز چادر بن جاتی تو میں اپنے جسم کا ایک ایک خلیہ اس چادر سے ڈھانپ لیتا اور ساری عمر کبھی باہر نہ جھانکتا۔

لیکن کس لئے؟ کیوں؟

کچھ نہ سمجھتے ہوئے' کچھ نہ جانتے ہوئے' میں اٹھ کر اس کے قدموں سے لپٹ گیا۔

وہ جلدی سے' ایک جھٹکے سے کئی قدم پیچھے ہٹ گیا جیسے میں اسے ڈسنا چاہتا ہوں۔

پھر درد اور اذیت کے دریا سے ایک اور ہر اٹھی۔

"میں کون ہوں؟ میں کیا ہوں؟ میں کیوں ہوں؟ میں کس لئے ہوں؟"

اور یہ صدا ایک مسلسل گونج کی صورت میں میرے اردگرد' چاروں طرف ناچنے لگی۔

میں نے تنگ آکر اپنے مجبور کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ لیکن یہ صدا کم ہونے کی بجائے اور بلند ہونے لگی اور پھر ساری کائنات پر محیط ہو گئی۔

بے فائدہ جان کر میں نے کانوں سے ہاتھ ہٹا لیئے۔

اب میرے اندر سے چیخیں بلند ہونے لگیں

"میں ظلم ہوں۔ میں قہر ہوں۔"

وہ سایہ میرے بالکل قریب آگیا۔ میری روح کانپ اٹھی۔

اس سایے کے چہرے پر خون کے دھبے تھے۔ اسکی شہ رگ کٹی ہوئی تھی اور اس میں سے تازہ' سرخ لہو جھٹکوں سے ابل رہا تھا۔

میری گھگھی بندھ گئی" میں نے چلانے کی کوشش کی لیکن آواز گلے میں جم

کر رہ گئی۔

مجھے اپنے بہت قریب، شاید میرے اندر سے بد نما قہقہوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے مڑ کر اسکی طرف دیکھا۔ وہ ہنس رہا تھا۔ اس کی کٹی ہوئی شہ رگ سے خون کے چھینٹے اڑ اڑ کر چاروں طرف بکھر رہے تھے۔

پھر یہ قہقہے دردناک آوازوں میں بین کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری کائنات میں غم ملول کر گیا۔ ہر طرف سے آہ و بکا کی صدائیں آنے لگیں۔

پھر آہستہ آہستہ ان صداؤں کا طلم ٹوٹنے لگا اور کائنات کا ہر نظریہ بکھرنے لگا ......

کائینات کے سارے اصول بٹے ہوئے دھاگوں کی طرح آپس میں الجھ گئے۔

میرے کندھے پر لٹکی ہوئی کلاشنکوف اب دو اجنبی ہاتھوں میں تھی اور وہ دو ہاتھ اس سے مسلسل فائرنگ کر رہے تھے۔ میں نے بار بار اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھا۔ فائرنگ کرنے والے ہاتھ میرے نہ تھے۔ جانے کس کے تھے؟

کلاشنکوف کی نالی سے گولیاں ایک دھار کی صورت میں نکل رہی تھیں اور اس عجیب و غریب سایے میں پیوست ہوتی جا رہی تھیں۔

خون بڑھتا جارہا تھا۔ جسم جگہ جگہ سے چھد رہا تھا۔ میں نے کلاشنکوف کا رخ دوسری طرف پھیر دیا اور اطمینان کی سانس لی اور اپنی تھکی ہوئی آنکھیں موند لیں۔ لیکن دھماکوں نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔

آہ و بکا میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ پورا کرہ ارض کراہ رہا تھا۔

کلاشنکوف کے سامنے ایک اور سایہ تھا۔ بالکل پہلے جیسا۔ اسکا جسم بھی چھد رہا تھا۔ میں نے تیزی سے ایک بار پھر کلاشنکوف کا رخ پلٹا۔ لیکن سامنے تیسرا سایہ آگیا۔

پورا صحرا ان سے سایوں سے اٹ گیا تھا اور کلاشنکوف اپنا کام کر رہی تھی۔

مایوس ہو کر میں نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے اور ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں

فضا گولیوں کے دھماکوں سے گونج رہی تھی۔ میرے نتھنوں میں خون اور بارود کی ملی جلی بو بسی ہوئی تھی۔ میرے ارد گرد مظلومیت کی تصویریں نزع کا رقص کر رہی تھیں۔

میں چیخ اٹھا

"تمہارا مجھ سے کیا رشتہ ہے؟"

صدا دل و دماغ سے اٹھی اور ہونٹوں پر آکر جم گئی۔ کلاشنکوف مسلسل بھونکے جا رہی تھی۔

مجھ میں اب اتنی ہمت نہ تھی کہ آنکھیں کھول کر دیکھ سکتا کہ محبت اور خلوص کے کتنے پھل دار، گھنے درخت میں نے کاٹ ڈالے تھے۔

ایک بار پھر سیاہ چادر تن گئی۔ احساس کی لاش میرے سامنے رکھی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے ٹھوکا دیکر اسے جگایا۔ لاش نے تھکی تھکی انگڑائی لیکر، نیم واہ آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔

میری روح کا تار تار جھنجھنا اٹھا۔ لمبے نوکیلے پنجوں والے ہاتھ میری طرف بڑھنے لگے۔ پھر ان ہاتھوں کی بند مٹھیاں کھلنے لگیں۔

میری آنکھیں حیرت اور بے یقین سے کھلی تھیں۔

ان ہاتھوں میں ضرورت اور خواہش اپنے چہروں پر کرنسی نوٹ سجائے بیٹھی تھیں۔ ان کے جلو میں اقتدار اور ہوس کے دیوتا شطرنج کی بساط پر انسانی مہرے آگے پیچھے بڑھا رہے تھے۔

کہیں سے ایک چنگاری اڑتی ہوئی آئی اور سب کچھ جلنے لگا۔ حدت سے میرا بدن تڑخنے لگا۔ میں اپنی ہی تخلیق کی ہوئی جنت میں جل رہا تھا۔

میں نے چاہا کہ چیخوں سے آسمان اور زمین دونوں کو سر پر اٹھالوں لیکن عجیب بات تھی کہ میں سب کچھ سن رہا تھا، مگر میری اپنی آواز میں نہیں سن رہا تھا۔ الفاظ ادا ہوتے اور ہونٹوں پر پپڑیوں کی صورت جم جاتے۔

اس اذیت کی تاب نہ لاکر میں خدا کو پکارا

اور خدا کا نام لیتے ہی میرے سامنے کا وسیع و عریض صحرا لاکھوں بتوں سے پٹ گیا۔

ہر بت کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے چھید رہی تھیں۔ ان کے چہروں پر شیطانی مسکراہٹیں تھیں۔ وہ مجھے اندر اور باہر سے دوہری آگ میں جلتا دیکھ رہے تھے۔ لیکن آگے نہیں بڑھتے تھے۔

میں لپک کر قریب ترین بت سے لپٹ گیا اور لپٹتے ہی میرے جسم کا تار تار سلگ اٹھا۔ یہ کوئی تیسری آگ تھی جس سے میں بالکل ناواقف تھا۔ فضا میں گوشت کی سڑاند بکھر گئی۔

میں تیزی سے پیچھے ہٹا تو اس بت کے کانوں کو سن کر دینے والے قہقہے' سیال' ابلتے ہوئے لوہے کی صورت میں کانوں کو پگھلاتے ہوئے میرے اندر اتر گئے۔

لاکھوں' کروڑوں بت قہقہے لگا رہے تھے۔ سارا صحرا ان قہقہوں کی لپیٹ میں آکر جلنے لگا۔ پھر یہ دہکتے ہوئے قہقہے' سرخ پتھروں کی مانند مجھ پر' میری روح پر برسنے لگے۔

میں لہولہان تھا۔ میرا جسم ایک کھلا زخم تھا جس میں سے سڑاند اٹھ رہی تھی۔ اچانک کہیں سے گدھوں کا ایک سیلاب سا آگیا۔ انہوں نے پورے آسمان کو ڈھانپ لیا۔ دن رات ہو گیا۔ گدھ اپنی نوکیلی' خوفناک چونچوں سے میرے جسم کو کھدیڑنے لگے۔

ذہن نے تاریکی کا سہارا لینا چاہا۔۔۔ اس اذیت سے بچنے کا بس یہی ایک طریقہ نظر آیا۔۔۔ بجھتے ہوئے احساس میں ایک ہلکی سی' مدھم سی روشنی کی کرن کوندی۔ پھر وہ روشنی آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ اس کی چمک میں اضافہ ہونے لگا۔

میرے زخموں کی ٹھیسیں کم ہونے لگیں۔ ان پر انگور آنے لگا۔ میں نے اس روشنی میں جھانکا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔

وہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اسکے نیلے ہونٹوں کے اندر اس کے دانت بج رہے تھے۔ اسکے چہرے پر بچپن کی قدرتی تازگی کی بجائے زردی کھنڈی ہوئی تھی اور اس کی معصوم آنکھوں میں بڑھاپے کے غم تھے۔ سوچ تھی۔

کسی سوال کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی کہانی اسکے چہرے پر رقم تھی۔

یہ وہی بچہ تھا جسے میں نے شراب خانے میں داخل ہوتے ہوئے چند سکے دیئے تھے۔

اس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیض سے ایک پٹی پھاڑی اور میرے جلتے ہوئے' رستے ہوئے زخموں کو صاف کرنے لگا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ گدھ جا چکے تھے' فضا میں سے سڑاند اور بو جھل پن غائب ہو گیا تھا۔ میرے اندر اور باہر کی دونوں آگیں دب گئی تھیں۔ سکون کی دھیمی دھیمی' لہریں میرے اندر اتر رہی تھیں' شاید میں سو گیا تھا' میں نے اپنی کلاشنکوف کندھے پر ڈالی اور شراب خانے سے باہر نکل آیا۔

کالئیے کا بت

کچھ مادر پدر آزاد لونڈے رات گئے دھوم دھڑکا کرتے آئے تھے اور یہ بت میرے گلے اونے پونے ڈال کر ویسے ہی دھوم دھڑکا کرتے چلتے بنے تھے۔

میرا دھندہ ایسا ہی ہے۔ اللہ نے مجھے کوکلے کے مافق گھڑا ہے۔۔ میرا اصلی نام کوئی نہیں جانتا۔۔ سب منہ پر کالیہ کہتے ہیں اور مجھے برا نہیں لگتا۔

دن بھر کی کوٹ پیٹ سے جسم بدبدا رہا تھا۔ بت کو آدھا اٹھائے، آدھا گھسیٹتا اندر لایا اور اپنی کوٹھڑی ورکشاپ میں ایک طرف پھینک دیا۔ سوچا صبح دیکھا جائے گا۔

بت کے گلے کا پھندہ کھینچا تانی سے ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ لمبی کھردری رسی پیروں میں کنڈلی مارے پڑی تھی۔ سارا جسم چھوٹے بڑے گڑوں سے پٹا پڑا تھا۔۔۔ سر اور ماتھا ایک طرف سے بالکل ہی پچک گئے تھے اور ایک ٹانگ گھٹنے سے بری طرح مڑ گئی تھی۔ دھات پر جمی وقت اور موسموں کی کاہی جگہ جگہ سے چھٹ گئی تھی۔

بت نے اپنے دائیں ہاتھ میں ایک موٹی، کھلی کتاب تھام رکھی تھی۔ کتاب کی مانگ

تڑخ گئی تھی۔۔ دونوں حصے اب تک کیسے جڑے رہ گئے تھے!

میں نے چھوٹی والی ہتھوڑی اٹھائی۔

ٹن ٹن۔۔ خالص پیتل نہیں ہو سکتا۔

ٹن ٹناٹن۔۔ تانبا بھی نہیں۔۔۔ میں نے کونسا قارون کا خزانہ لٹایا ہے۔

میں نے جلدی جلدی بھٹی میں کوئلہ بھرا اور خوب سارا مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگادی۔

جتنی جلدی کام نپٹ جائے اچھا ہے۔۔۔ کوئی دعویدار آدھمکا تو خواہ مخواہ کا پھڈا کھڑا ہو جائیگا۔

میں نے بت کو گھسیٹا اور چھینی اٹھالی۔۔ کاٹ پیٹ ضروی تھی تاکہ کٹھالی اسے سہار سکے۔

پچکا ہوا سر اور ماتھا دیکھ کر میری ہنسی چھوٹ گئی۔ میں نے پہلی چوٹ یہیں لگائی۔ چھینی اچانک اچٹی اور پھدک کر سیدھی ماتھے پر آن بجی۔۔ دو چار پھیکے' رینگتے تاروں کے ہیولے سے دکھائی دیئے اور بس۔۔۔

پھر نجانے کتنے عرصے بعد تاریکی کی تنی چادر پر ننی منی کرنوں کی پھوار برسنے لگی۔۔ آہستہ آہستہ مطلع صاف ہونے لگا اور پھر چمکتا ہوا سورج نکل آیا۔

بت نے ایک ہلکی سے جھر جھری لی۔۔ اسکے ہونٹوں سے ایک گھٹی ہوئی سسکی نکل گئی۔ پھر وہ کراہتے ہوئے سیدھا ہونے لگا۔ اب وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔

اس نے بائیں ہاتھ سے دھیرے دھیرے کتاب پر جمی گرد پونچھی' پھر اپنا جسم جھاڑنے لگا۔

میں نے جلدی جلدی اپنی انگلی دانتوں تلے لیکر کاٹی۔ خاصی تکلیف ہوئی۔

اس عجیب وغریب واقعہ سے مجھے خوفزدہ ہو کر' چیخیں مارتے ہوئے باہر اٹھ بھاگنا چاہئے تھا۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ میں بڑے اطمینان سے واہیں پڑا بت کو دیکھتا رہا۔

بت نے ہاتھ بڑھا کر' ایک ٹانگ پر کودتے ہوئے لوہے کی اکلوتی کرسی کھینچی اور

لڑکھڑاتا ہوا اس پر جم گیا۔

اس نے ایک طویل گہری نظر مجھ پر ڈالی۔۔۔ پھر اس کے ہونٹ ہلے۔

"اٹھو۔۔۔ تمہاری بھٹی دہک رہی ہے۔۔ دیر کروگے تو راکھ ہو جائیگی۔۔ مجھے جلدی سے پگھلا کر میری اذیت ختم کردو۔"

ہتھوڑی میرے بالکل قریب رکھی تھی۔ چھینی بھی دسترس میں تھی۔

آج کی صبح ہی کچھ ٹیڑھی تھی۔ ہر چیز الٹی پڑ رہی تھی۔ شکاری کو نشانے پر آئے شکار سے ہمدردی ہونے لگی تھی۔

کتاب سے روشنی کا آبشار پھوٹ رہا تھا۔ کمرے میں عجیب سی ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی۔

بہت بڑی مصیبت سے کراہتا ہوا اٹھا۔

"کیا آج کام کرنے کا ارادہ نہیں ؟"

کام تو کرنا ہے۔۔ ورنہ کالیہ کھائے گا کہاں سے !

میں نے ایک نظر ہتھوڑی چھینی پر ڈالی۔۔۔ دونوں بہت دور چلی گئی تھیں۔۔۔ میری پہنچ سے باہر۔ اچانک میری کھوپڑی کے اندر ایک بے معنی سوال نے چھلانگ لگائی۔

"تم غیر ملکی ہو نا ؟"

وہ چونکا اور اس کے جسم کے کئی حصے بج اٹھے۔

اسکی نگاہیں مجھ پر جمی تھیں۔ انکی پھیکی روشنی کچھ اور ماند پڑ گئی تھی۔

"تم نے کیسے جانا ؟۔۔۔ میرے بھی تمہاری طرح دو کان ہیں۔ دو آنکھیں اور ایک ناک ہے۔ مجھے اس ملک میں رہتے ہوئے سو برس سے اوپر ہونے کو ہے۔"

اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن شدید اذیت نے اسکے ہونٹوں کو بھینچ لیا۔

اسکی بھوری آنکھیں، چمکتی رنگت۔۔۔ لو۔۔۔ یہ سب تو چائے والے پٹھان کے لونڈے کے پاس بھی ہے۔ وہ منتظر تھا۔۔۔ جواب دینا ضروری ہو گیا تھا۔

"ہمارے ہاں بت بننا اور بنانا حرام ہے۔"

وہ اذیتوں کے عذاب جھیلتے ہوئے ہنس پڑا۔ اسکے قہقہوں میں سے تھوکتی طنز مجھے بالکل اچھی نہ لگی۔ مجھے سنجیدہ دیکھ کر وہ سنبھل گیا۔

"تم مجھے سمجھدار آدمی لگتے ہو۔"

اب ہنسنے کی میری باری تھی اور میں خوب کھل کر کافی دیر تک ہنستا چلا گیا۔

"بھولے بادشاہ۔۔ اگر میں سمجھدار ہوتا تو اتنا معمولی چور ہوتا۔۔ میرے ساتھ کے چاند پر پہنچ گئے ہیں۔"

وہ کافی دیر گم سم اوپر ٹین کی سیاہ چھت کو گھورتا رہا۔۔ پھر اس نے خالی ہاتھ کی انگلی سے اپنی کتاب اٹھائی۔

"کچھ پڑھے لکھے ہو؟"

مجھے غصہ آگیا۔۔۔ سینکڑوں سال دنیا کے تقریباً ہر قسم کے آدمی پر حکومت کر ڈالی۔ لیکن سمجھ کر ایک کو نہ دیا۔ اب اسے کیا پتا تا۔ ابا نے سانس لئے بغیر دس ایک سالوں میں پوری پلٹن تیار کر ڈالی۔۔ وہ تو اللہ بخشے اللہ نے والدہ کو جلدی اٹھالیا ورنہ۔۔۔ راشن وردی کا ٹوٹا پڑا رہا۔۔ ٹانگیں جسم کا بوجھ سہارنے کے قابل ہوئیں تو حسینے قلعی گر کے پاس بٹھا دیا۔

بت نے ایک طویل سانس اندر کھینچا۔ اسکے چہرے پر بجھی راکھ کے جھکڑ اڑنے لگے۔

باہر سورج خاصا اونچا ہو گیا تھا اور بلا روک ٹوک اندر جھانکنے لگا تھا۔

بت نے ایک بار پھر مجھے میری بھٹی اور اپنی اذیت یاد دلائی۔

میں نے ہاتھ پیر اکٹھے کرنے کی کوشش کی۔

"چل کالیئے۔۔ کب تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے بتوں کی باتیں سنتا رہے گا!"

میری کھوپڑی میں کلبلاتے کیڑوں نے مجھے پھر روک لیا۔ اللہ جانے میرے جیسے کی کھوپڑی میں ایسے کیڑوں کی کیا ضرورت ہے۔

"آخر تم ہو کون؟"

اسکی بجھی آنکھوں کی راکھ لو دینے لگی۔ اور وہ ماضی کی روشن گلیوں میں مہکتی یادوں

کی تتلیاں پکڑنے نکل گیا۔

"بہت پرانی بات ہے۔۔ مجھے دور دیس سے تمہارے دیس بھیجا گیا تھا۔۔ تا کہ میں تم لوگوں کو تم سے چرالوں۔"

میرے اندر ہنسی کا لاوا ابل پڑا اور بری طرح سے پھوٹ پڑا۔

"ہم بھی کوئی چرانے کی چیز ہیں! لو۔۔ جس کو چاہو چرالو۔۔ مجھے ابھی چرانو اور لے چلو جہاں چاہے۔"

اسکے ہونٹوں سے درد میں لتھڑی آہ نکل گئی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔۔ تمہارے پاس چرانے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ تمہیں دیکھ کر میں الٹا کچھ لٹانے کا سوچنے لگا۔"

اس نے انگلی سے کتاب بجائی۔۔

"میں نے علم لٹانا شروع کر دیا۔ مجھے اپنا وطن بھول گیا۔۔ ہر شے بھول گئی۔۔۔ میں تمہارا ہو کر رہ گیا۔ میرا لگایا پودا دھیرے دھیرے پھلنے پھولنے لگا۔۔ اور پھر آسمان کو چھونے لگا۔"

اسکے چہرے پر خوش رنگ تتلی مسکراہٹ لوٹ آئی تھی۔

پھر اس نے پہلی بار کھل کر قہقہہ لگایا۔۔ اسکی اذیت کا دور دور تک نام و نشان تھا۔

"میرے جیتے جی میرے ایک نالائق شاگرد نے میرا مجسمہ بنا ڈالا۔۔ وہ غیر ملکی نہ تھا۔ تمہارا اپنا تھا' میں نے اسے بہت روکا۔ اس نے ایک نہ سنی اور ایک دن تالیوں کے طوفان اور محبت سے چمکتے چہروں کے درمیان مجھے میرے ادارے کے پہلو میں گیٹ کے ساتھ سڑک پر نصب کر دیا۔

"میں اندر سے خوش تھا۔۔ میرے اردگرد آگہی کے نور سے چمکتی پیشانیاں تھیں۔ میں ہنسی خوشی وقت اور موسموں کی مار کھاتا رہا۔

"کارپوریشن نے شاہراہ کو خوبصورت بنانے کے لئے دونوں اطراف درخت لگا دیئے۔

"پیڑ دنوں میں جوان ہو گئے۔ میرے اوپر' دائیں بائیں گھنے پتوں کا سائبان تھا۔۔ میں شاخوں میں جھانک جھانک کر نئی پر امید زندگی کے پیروں کی کھٹ پٹ سنتا رہا۔ میں بہت خوش اور مطمئن تھا۔

"پھر بٹوارا ہوا۔۔ آدمی بٹ گیا۔۔ ہر شے کا چہرہ بدل گیا۔ آنکھوں کے زاویے بدل گئے۔۔ دل بدل گئے۔۔ ایک آنکھ ہنس رہی تھی دوسری رو رہی تھی۔

اس طوفان میں میرے اوپر کھڑا گھنا درخت ٹوٹ کر گر گیا اور میں ننگا ہو گیا۔

میری طرف اٹھنے والی آنکھوں کی محبت نفرتوں سے چاٹ لی۔

کل سہ پہر کچھ نوجوان لڑکے لڑکیاں کتابیں پٹختے میرے ارد گرد جمع ہونے لگے۔ وہ گلے پھاڑ پھاڑ کر میرے خلاف نعرے لگا رہے تھے کیونکہ میں غیر ملکی تھا۔۔ ان کا دشمن تھا۔

"ہجوم بڑھتا جا رہا تھا...... کسی نے غصے میں مجھ پر تھوکا اور......

"سڑک پر ٹریفک رک گئی تھی...... کہیں سے ڈنڈے آگئے...... پھر کدالیں آگئیں۔

لمحوں میں میرے پیروں کے نیچے چبوترے کو ادھیڑ ڈالا گیا اور میں ٹن ٹن کرتا' اپنی کتاب سمیت گرم فٹ پاتھ پر آ رہا۔

"کسی نے رسی بڑھائی...... کسی اور نے جلدی جلدی پھندا بنایا اور میرے گلے میں ڈال دیا۔"

اسکی آنکھیں گیلی تھیں اور اسکی آواز بھر آگئی تھی۔

ورکشاپ میں کبھی ایسا سناٹا نہ ہوا تھا۔

اچانک اس سناٹے میں ہر طرف چھوٹی چھوٹی ہزاروں ہتھوڑیاں اچھلنے کودنے لگیں...... پھر بھاری پردا آہستہ آہستہ اٹھنے لگا۔

میرا ہاتھ ماتھے کی طرف لپکا...... زخم سے رسنے والا خون ابرو تک آکر جم گیا تھا۔

بت میرے قدموں میں بکھرا پڑا تھا...... میرے پاؤں سمٹ کر پیچھے ہٹ گئے۔

بھٹی میں کوئلے راکھ ہو چکے تھے...... میں نے نیم گرم راکھ کی مٹی لے کر زخم

پر مل دی۔

سورج عین سر پر تھا...... آدھا دن بے کار نکل گیا تھا۔

"چل کاپئے...... تجھے کس سے کیا لینا دینا...... کام شروع کر۔"

میں نے چھینی ہتھوڑی اٹھائی اور کام شروع کر دیا۔

مجھے اپنے آپ پر کالیئے پر حیرانی ہو رہی تھی...... میرے ہاتھ 'میرے حواس قابو میں نہ رہے تھے...... شاید کن پٹی کی چوٹ کا اثر تھا۔

میں بت کے ٹکڑے کرنے کی بجائے اس کے زخموں پر مرہم رکھ رہا تھا۔

پورے تین دن لگے...... باقی سارا کام ٹھپ پڑا رہا۔

بت کے سارے زخم بھر گئے تھے ...... مڑی ہوئی ٹانگ اصلی حالت میں لوٹ آئی تھی...... کتاب اس مہارت سے جڑی تھی کہ اسکی مانگ میں سیندور کی کمی رہ گئی تھی۔

میں نے اپنا خاص' قیمتی کیمیکل نکالا اور مجسمے کی جسم کی صفائی کرنے لگا۔ کرتا رہا۔

بت میرے سامنے کھڑا تھا...... اتنا تازہ 'اتنا نیا...... جیسے ابھی ابھی اپنے خالق کے ورکشاپ سے خود اپنی ٹانگوں پر چلتا ہوا آ رہا ہو۔

میں نے اسے ایک کونے میں دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا ہے...... جب نظر پڑتی ہے تو میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں۔

'کالیئے...... تو اس بت کا کیا کرے گا...... خواہ مخواہ جگہ گھیرے پڑا ہے......"

میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں......

جہاں میرے کوٹھڑی ورکشاپ میں ہزاروں بے کار ٹین ڈبے پڑے ہیں...... یہ بھی پڑا رہے گا......

میں نے اس پر ایک صاف ستھری چادر ڈال کر ڈھانپ دیا ہے۔ کسی وقت بیکار سے بیکار شے بھی کام آ جاتی ہے۔

خرگوش اور کچھوا

موسم سرما کی لمبی رات بے حد تاریک تھی۔

خوف کی ٹھنڈی زنجیروں میں ٹھٹھرتی زندگی آخری سانسوں پر پہنچ چکی تھی......

بے بس مجبور آنکھیں آسمان میں ٹکی تھیں۔

پھر معجزہ رونما ہوا...... اچانک برف کا طلسم چھناکے سے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوا اور اندھے سورج کی آنکھ میں روشنی لوٹ آئی۔

نئی صبح بڑی خوشگوار تھی...... ہر طرف زندگی اپنے آپ کو جھٹک جھٹک کر بیدار ہونے لگی۔

ہر طرف جما کہر اراتوں رات پگھل گیا۔

جوہڑ کی تہہ میں سوئے کچھوے کو اس تبدیلی کے خبر ہوئی تو اس نے اپنی سن ٹانگیں زور زور سے چلائیں، اکڑی گردن کو خول سے باہر دھکیل کر بار بار جھٹکے دیئے...... پھر محتاط انداز میں دھیرے دھیرے اوپر روشنی کی طرف سفر کرنے لگا۔

پانی کی سطح پر پہنچ کر اس نے نئے موسم کا جائزہ لیا۔

ہر طرف سنہری روشنی پھیلی پڑی تھی...... بانجھ درختوں پر نئی کونپلوں کے جنگل اگ آئے تھے۔ برے وقت میں درختوں کو چھوڑ جانے والے پرندوں کے جھنڈ لوٹ آئے

تھے...... اور سب پھڑ پھڑا پھڑ پھڑا کر خوب بلند آواز میں بہار کے گیت گا رہے تھے۔

کچھوا خوش خوش کنارے پر آیا...... ایک طویل آسودہ جمائی لی...... پھر خوب پھیل کر نرم گھاس پر لیٹ گیا۔

نرم دھوپ اس کے نیم مردہ جسم میں زندگی بھرنے لگی...... اس پر مستی اور پھر نیند کا غلبہ ہونے لگا۔

اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"جانے بدمعاش خرگوش زندہ بھی ہے یا نہیں!"

اس کا قہقہہ گلے میں پھنس گیا......

کوئی محتاط قدموں، سنبھل سنبھل کر اس کی طرف آرہا تھا۔

کچھوا عادتاً تحفظ کی خاطر فوری طور پر پانی میں کودنے کو تھا...... لیکن خرگوش کو دیکھ کر رک گیا۔

اس بدمعاش نے ایک دن بھی انتظار نہیں کیا...... موسم کھلتے ہی میدان میں کود پڑا ہے۔

خرگوش دو جستوں میں اس کے سر پر آکھڑا ہوا۔

"میرے ازلی دشمن...... دوڑ کے دن آگئے ہیں۔ اب میں تم سے اپنی ہار کا بدلہ لے لوں گا۔"

کچھوا کھلکھلا کر ہنسا۔

"اتنے دن کہاں دبکے پڑے رہے؟"

"جہاں تم چھپے بیٹھے تھے"

دونوں کے سر جھک گئے...... ان کی زبانوں اور کانوں پر خوف جم گیا۔

دور کہیں کوئی کتا بھونکا...... کسی درخت پر ایک ساتھ بہت سارے طوطے چلائے...... پھر دیکھتے ہی دیکھتے، سارا جنگل گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگا۔

کچھوا اور خرگوش بھی اس شور کا حصہ بن گئے۔

خرگوش اچانک چپ ہوگیا...... وہ تھوڑی دیر ہنستے، چیختے کچھوے کو حقارت سے دیکھتا رہا...... پھر رہ نہ سکا۔

"بس بس...... بہت ہو چکا' اب دوڑ کی بات کرو۔"

کچھوے کے قہقہوں میں تیزی آگئی۔

"تم ہر موسم بہار میں مقابلہ مقابلہ کرتے آدھمکتے ہو۔ تم ہار چکے ہو۔ زندگی میں بار بار مواقع نہیں ملتے۔"

خرگوش تلملا اٹھا...... اس کا اوپر والا ہونٹ پھڑکنے لگا۔

"ست' پھسڈی...... رینگنے والے کیڑے...... تم مجھ سے کیسے جیت سکتے ہو! تیرا میرا کیا مقابلہ؟ تم ڈھینچوں' ڈھینچوں' اور میں...... پر لگ جائیں تو پرندوں کو پیچھے چھوڑ دوں...... میرے خلاف سازش کی گئی تھی...... مجھے پہاڑی والے بندر نے سب بتا دیا تھا"

کچھوا منہ پھیر کر دور اونچے پہاڑوں کی چوٹی پر پھیلتی سکڑتی دھند میں بندر کے مسکن کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کے اندر نفرت کا مروڑ اٹھا...... وہ بڑبڑانے لگا۔

"یہ بندر...... اس سے ہمارا پیچھا کب چھوٹے گا!"

وہ سوچوں کی دلدل میں نیچے ہی نیچے دھنستا چلا گیا۔

"ہم آہستہ اور سیدھے چلنے والوں کا کیا بنے گا! ہماری آنے والی نسلیں بھی اس طرح آلودہ پانی میں ہی جئیں مریں گی؟"

خرگوش کے کریہہ آواز خراٹے اسے واپس کھینچ لائے...... وہ سرکنڈوں میں منہ دیئے خواب خرگوش کے مزے اڑا رہا تھا۔

خرگوش اچانک تڑپ کر اٹھا...... کس ڈراؤنے خواب نے اسے جھنجھوڑا تھا۔

وہ کچھ دیر سوتی جاگتی آنکھوں سے کچھوے کو گھورتا رہا...... پھر اچھل اچھل کر کچھوے پر چیخنے لگا۔

"رینگنے والے کیڑے...... اب کے ایسا نہیں ہوگا...... میرے بار بار سو جانے میں

بھی تیرا ساتھ ہے...... اگلی دوڑ میں پورے انتظامات کے ساتھ آؤنگا۔"

خرگوش نے شرافت کی سیڑھی اٹھا کر ایک طرف پھینک دی...... اس کے منہ سے چھما چھم غلاظت برسنے لگی۔

کون اس نیچ کے منہ لگے...... کمینوں سے عزت بچانی چاہئے۔"

کچھوے نے اپنے آپ کو دھکیل کر واپس پانی میں ڈالا اور نیم گرم پانی میں ہلکورے کھاتا دور نکل گیا...... اب وہ خرگوش کی پہنچ سے باہر تھا۔

اس نے جگہ جگہ' رک رک کر پرانے دوستوں عزیزوں اور ملنے والوں سے تعلقات کی تجدید کی اور پھر ایک لمبا چکر کاٹ کر دھیرے دھیرے اپنے کنارے لوٹ آیا۔

اونچے پہاڑ پر شام سیاہ آنچل اوڑھے اترے چلی آ رہی تھی۔

کچھوے نے آنکھیں موند لیں۔

بندر کے ٹھکانے پر کون کون جمع ہوگا! کیا کیا سوچا جا رہا ہوگا! لعنت ہے خرگوش پر......'

مایوسی اپنے سارے بازو پھیلائے اس کی طرف بڑھنے لگی۔

مجھے دوڑوں کا سلسلہ یکسر بند کر دینا چاہئے...... وقت بدل گیا ہے...... اب میں خرگوش سے نہیں جیت سکتا۔

وہ جوہڑ کے ڈھلوان کنارے بڑے بڑے پتھروں میں دبکا بے سدھ پڑا تھا...... اس کے چاروں طرف تاریکی سیاہ گالوں کی صورت گر رہی تھی۔

ٹن...... ٹن...... ٹن......

کچھوا اچھلا...... بہت سارے پتھر لڑھک کر پانی میں جا گرے۔

ٹن...... ٹن...... ٹن......

مایوسی کا پہاڑ فصیلوں والا قلعہ لرزا اور پھر دھڑام سے زمین پر آ رہا۔

کچھوے نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور اندھا دھند پانی کو چیرتا شمالی کنارے پر جا پہنچا...... وہ بحد شرمندہ تھا...... اس کا دھیان اس طرف کیوں نہ گیا تھا۔

لوہار ٹن ٹنا ٹن اپنی جھونپڑی میں مصروف تھا...... اس کی دہکتی بھٹی سے اٹھتے شعلے رات کی سیاہی کو چاٹ رہے تھے۔

کچھوے نے بے دھڑک اپنی لمبی گردن دروازے کے اندر ڈال دی۔

لوہار نے پلٹ کر دیکھا...... اس کے چہرے پر دمکتی مسکراہٹ ابھر آئی...... اس نے اپنا وزنی ہتھوڑا روک لیا۔

"آؤ دوست...... میں تو سمجھا تھا کہ تم اپنوں کو بھول بیٹھے ہو۔"

کچھوا بھٹی کی تیز آنچ سے بچ کر ایک طرف سمٹ گیا۔

"سرد موسم میں باہر نکلنا کتنا مشکل ہوتا ہے! گلے شکوے بعد میں...... اس خرگوش کے بچے کا کیا کروں' اس نے میرا جینا حرام کر دیا ہے...... بس ایک ہی رٹ...... میرے ساتھ پھر سے دوڑ لگاؤ۔"

لوہار نے ماتھے پر چمکتے ستارے پونچھ کر جھٹکے...... پھر معنی خیز انداز میں کھانسا۔

"تو ہو جائے دوڑ......"

"لوہار بھائی! اب وہ راستے میں سونے کا نہیں' اور اس کی پشت پر پہاڑی والا بندر ہے۔"

بندر کے نام پر لوہار کی آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں۔

وہ کچھوے کے بالکل قریب آگیا اور اس کے خول پر تھپکیاں دینے لگا۔

"تم لوہے کے بنے ہو۔ تمہیں کوئی نہیں ہرا سکتا۔"

پھر دونوں میں کافی دیر تک میٹھی میٹھی سرگوشیاں ہوتی رہیں۔"

جب کچھوا رخصت ہوا تو اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا...... اور وہ تاریکی میں پورا اعتماد سے رینگ رہا تھا۔

صبح بھدی کھٹ پٹ سے کچھوے کی پرسکون نیند ٹوٹ گئی...... خرگوش کا منحوس چہرہ اس کے سامنے تھا۔

اس نے خرگوش کو بولنے کی مہلت ہی نہ دی۔

"سنو...... گندی زبان چلانے کی ضرورت نہیں...... میں تمہیں ایک بار پھر ہرانے کے لئے تیار ہوں...... جگہ اور دن کا انتخاب تم خود کرو...... اور اپنے حمایتی بندر کے بچے کو ساتھ ضرور لانا تاکہ وہ تمہارا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔"

خرگوش ہوا میں اچھلا اور قلابازیاں کھاتا پہاڑ کی چوٹی کی طرف دوڑ اٹھا۔

دوڑ کا دن آگیا۔

جوہڑ کے کنارے والا میدان پرانے رقیبوں کا مقابلہ دیکھنے والوں سے ٹھسا ٹھس بھر گیا۔ پرندے تک دانے دنکے کی تلاش کو نہ نکلے تھے...... اور چوں سمیت شاخوں پر لٹکے تھے۔

خرگوش سورج نکلنے سے پہلے ہی اسٹارٹنگ لائن پر آکھڑا ہوا تھا...... وہ بار بار پچھلے پیروں سے گھاس کو رگڑ رہا تھا اور گردن ہلا ہلا کر گلے میں پڑے پٹے پر سجے گھنگھرو بجا رہا تھا۔

پھر اس کے صبر کا دامن چھٹنے لگا...... اور وہ پاگلوں کی طرح چلا اٹھا۔

"بزدل، بھگوڑا...... ڈر کر چھپ گیا ہے۔ میں جیت گیا...... میں جیت چکا ہوں۔"

عین اس وقت کچھوے کا دوست لوہار آن پہنچا...... اس نے اچھلتے کودتے خرگوش کو دیکھ کر زوردار قہقہہ لگایا۔

"بے غیرت...... ہارنے کے لئے تیار ہو جاؤ...... تمہارے بندر کا یہ پٹہ اور گھنگھرو تمہارے کسی کام نہیں آئیں گے۔"

اس نے اپنی پٹاری کھولی اور اندر سے کچھوے کو نکال کر اسٹارٹنگ لائن پر رکھ دیا۔

خرگوش نے اوپر گھنے درخت کو چھانا...... بندر لوہار کو دیکھتے ہی نو دو گیارہ ہو چکا تھا۔

طوطے نے توپ چلائی...... خرگوش چشم زدن میں کچھوے کو پیچھے چھوڑ گیا۔

خرگوش اڑا چلا جا رہا تھا...... اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔

اچانک اسے اپنے پیچھے ایک عجیب و غریب خوفناک آواز سنائی دی...... وہ تھوڑی دیر تک کچھ نہ سمجھ پایا۔

پھر کچھوا اڑتا ہوا زن سے اس کے پاس سے نکل گیا۔

خرگوش کا پورا جسم پتھر ہو گیا...... وہ سن پڑا دور غائب ہوتے کچھوے کو دیکھتا رہا۔

دور سے ایک بار پھر وہی آواز ابھری...... کچھوا ڈھول اڑاتا واپس آرہا تھا۔

خرگوش کی آنکھیں حلقوں سے باہر لٹک رہی تھیں۔

لوہار نے جھک کر کچھوے کی پیٹھ پر تھپکی دی...... پھر اس کے خول پر چپکی ہوئی چھوٹی سی مشین الگ کر کے اپنی پٹاری میں ڈال لی۔

کچھوے نے اپنی لمبی گردن ہوا میں بلند کی...... اور پھر لوہار کے کھلے ہاتھوں پر رکھ دی۔

تالیوں، چیخوں اور دوسری اچھی بری آوازوں کے سیلاب سے جنگل گونج اٹھا۔

اس شور میں خرگوش ہر کسی کو بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ ہارا نہیں...... اسے ہرایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ دھاندلی ہوئی ہے...... دوڑ دوبارہ ہونی چاہیئے۔

شہر کا آدمی

عابد خان بابا کی پائینتی بیٹھا بیٹھا اونگھنے لگا تھا۔

پھنکارتی آگ دوپہر بے پردہ کھڑکی کے راستے اچانک اندر آدھمکی۔

اس نے کسما کر آنکھیں کھولیں اور ہاتھ چلا کر نتھنوں کے اندر سراغتی مکھیوں کی فوج کو اڑانے کی کوشش کی۔ پھر فرش پر اوندھے منہ پڑی چپلیں پہن کر اٹھ کھڑا ہوا۔

چاروں طرف بے ترتیبی سے بکھری سرکاری اسپتال کی جنرل وارڈ لاوڈ اسپیکر سے چیخ چیخ کر تیسری دنیا کے مصائب بیان کر رہی تھی۔

بابا کی سانس آکسیجن کے زور پر دھاڑیں مار مار چلے جا رہی تھی۔ گلوکوز کی اوندھی بوتل سے قطرہ قطرہ زندگی ٹپک رہی تھی۔

ایک ایک مریض کے ساتھ پورا محلہ سب چھوڑ چھاڑ اسپتال چلا آیا تھا...... صرف وہ اکیلا تھا۔

بیوی؟ اس کا مردوں میں کیا کام! شہر میں پیدا ہونے اور پروان چڑھنے کے باوجود

اتنا بے غیرت نہیں ہوا...... بچے؟ ابھی اس قابل نہیں ہیں کہ انہیں شہر کی بھوکی خونخوار سڑکوں پر کھلے عام چھوڑ دیا جائے۔

اسپتال آکر عابد خان کو شدت سے احساس ہوا کہ اس کے بابا نے وطن چھوڑ کر غلطی کی تھی...... اور اب اس غلطی کی سزا نجانے اس کی کتنی نسلوں کو بھگتنا ہو گی!

"خدا تو وہاں بھی تھا...... ہر جگہ ہوتا ہے...... جیسی تیسی روزی روٹی ملتی رہتی...... یہاں آکر کون سے محل کھڑے کر لیئے ہیں...... محنت مزدوری کی بجائے کلرکی کی ذلت...... ہر کسی کا غلام...... سنا ہے وہاں وقت پر، دکھاوے کو ہی سہی، دشمن بھی چلے آتے ہیں...... اور یہاں نسلیں ہتانے کے باوجود کوئی اپنا نہیں بنتا"۔

اچانک اسکے کندھے پر ایک ملائم ہاتھ نے دستک دی۔

وہ چونک کر پلٹا۔

فرشتہ!

آنے والا کفن سے زیادہ بھڑکیلے سفید کپڑوں کے پیچھے چھپا تھا...... اس کے جسم کے ہر حصے سے مسمسی گیلی مسکراہٹ رس رہی تھی۔

"گھبراؤ نہیں...... مجھے اپنا دوست سمجھو۔"

عابد خان نے جلدی جلدی اپنے اندر گہری دلدل میں ہاتھ پاؤں چلائے اور ایک نیم مردہ مسکراہٹ کو بالوں سے کھینچ کر چہرے تک لانے کی کوشش کر ڈالی۔

"اس ظالم دور میں آدمی زندہ رہے تو مصیبت...... مر جائے تو مصیبت کا پہاڑ...... ہمیں تمہاری پریشانوں کی لحہ بہ لحہ رپورٹ ملتی رہی ہے' اب وقت آگیا ہے کہ مدد کا ہاتھ بڑھائیں۔"

عابد خان محتاط نظروں سے اجنبی کو جانچ رہا تھا۔

"شہر کے آدمی کا کبھی بھروسہ نہ کرو......"

بابا دور دھندلے بادلوں میں انگلی چمکا چمکا کر اسے درس دے رہے تھے۔

فرشتے نے بغل میں سوئی فائل کو کھینچا اور دوہری تہہ کا کاغذ نکال کر عابد خان کے

ہاتھ میں دے دیا۔

"اس میں تمہارے تمام مسائل کا حل موجود ہے...... میں تھوڑی دیر بعد واپس تمہارے پاس آؤنگا۔"

وہ دو قدم چل کر رک گیا.........................

"ایک بات کا خیال رکھنا.......... وقت بہت کم ہے۔ جتنی جلدی فیصلہ کرلو گے' تمہارے لئے اتنا ہی بہتر ہو گا۔"

فرشتہ ہر طرف آسودہ' فاتحانہ مسکراہٹ نچھاور کرتا چلا گیا۔

عابد خان کی نگاہیں بابا کی طرف اٹھ گئیں۔

"پپوٹے تھر تھرائے ہیں یا میرا وہم ہے...... تیز دھوپ میں یقین اور گمان بری طرح سے آپس میں گڈمڈ ہونے لگتے ہیں۔"

بابا نے آنکھیں کھولیں..... دھلی سپاٹ' بے جان جھیلیں.......... اچانک ان جھیلوں کی سطح پر ایک نیم مردہ' بے رنگ پروں والی بطخ نے پھڑ پھڑانے کی کوشش کی۔

بابا کچھ کہنا چاہتے ہیں!

عابد خان جلدی سے جھکا اور کان بابا کے ہونٹوں سے جوڑ دیا۔

وہ جھکا کھڑا رہا..... پھر کمر پر ہاتھ رکھ کر سیدھا ہو گیا۔

بابا بغیر کچھ کہے واپس اپنی انجانی دنیا میں لوٹ گئے تھے۔

"اللہ جانے آئے بھی تھے یا.............."

کاغذ ابھی تک اسکے ہاتھ میں تھا.......... اس نے اسے کھولا۔

اوپر جلی حروف میں کسی ویلفیئر سوسائٹی کا نام تھا.......... نیچے ایک فہرست تھی۔

آنکھیں.......... دو ہزار

گردے.......... پانچ ہزار

دل پھیھڑے.......... آٹھ ہزار

مکمل جسم.......... بیس ہزار.......... معاوضہ فوری اور نقد۔

عابد خان نے اپنی جیب ٹٹولی.......... ہاتھ ریز گاری سے چھوا............ اس نے گھبرا کر پورا ہاتھ جیب کے اندر دھکیل دیا اور جلدی جلدی کونے کھدرے کھنگال ڈالے۔

آخری سمٹا ہوا نوٹ موجود پا کر اسکی گھبراہٹ میں کمی آگئی۔

وہ بابا کے بستر کے پائے سے ٹیک لگا کر ننگے فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا...... اور اس عجیب وغریب اشتہار پر غور کرنے لگا۔

"آنکھیں...... آنکھیں بیچی جاسکتی ہیں؟ آنکھوں کے ہوتے ہوئے زندگی عذاب ہے اور انکے بغیر......

گردے؟

اس نے کہیں پڑھا تھا کہ انسان ایک گردے کے ساتھ قطعی طور پر نارمل زندگی گزار سکتا ہے...... پانچ ہزار اس مہنگے دور میں بھی خاصی بڑی رقم ہے...... ابا کا علاج ڈھنگ سے ہو سکتا ہے۔

اس نے ادویات کی بو کی ماری ہوا میں ایک طویل سانس لیا۔

دل پھیپھڑے...... اس گئی گزری حالت میں بھی اسے ہنسی آگئی۔

یہ شخص بہروپیا لگتا ہے۔

پھر اس کی ہنستی آنکھیں رو پڑیں۔

"جسم تک!"

'ظالم لوگ.......... ایسی کڑی گھڑی میں بھی مذاق کرنے سے نہیں چوکتے۔'

اچانک اسکی بھٹکی ہوئی عقل واپس لوٹ آئی۔

ابا۔

اسکے اندر سے اذیت میں سسکیاں بھرتی چیخ پھٹ پڑی...... اور پھر ہونٹوں کے اندر ہی مر گئی۔

اس نے ڈرتے ڈرتے بابا کی طرف دیکھا۔

بابا کے ہونٹ بری طرح سے بھینچے تھے اور انکے ماتھے کی جھریاں گہری ہو گئی تھیں۔

اس نے غصے میں کاغذ پرزا پرزا کیا اور پھر ایک طرف پھینک دیا۔

آج صبح ہی اس نے بیوی سے پراویڈنٹ فنڈ سے رقم نکلوانے کا ذکر کیا تھا۔

بھیڑ نے اچانک شیر کی کھال اوڑھ لی۔۔ اور لمبے تیز دانتوں سے اسے بھنبھوڑ ڈالا۔

"میرے بچوں کا گلا گھونٹ دو...... پھر لگا دو سب کچھ اپنے باپ پر۔"

آمنہ کا یہ بالکل نیا روپ تھا...... اسکے اندر شہر بولنے لگا تھا......

تیز دھوپ میں اندر کی غلاظتیں باہر نکل آتی ہیں۔

وہ الجھا الجھا' پریشان گھر سے نکل لیا تھا۔

پھٹے کاغذ کا ایک پرزہ بستر کے پائے سے لگا گرم ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔

اسکی آنکھیں وارڈ میں پھرنے لگیں۔

اس نے قریب آکر محتاط' خوفزدہ انداز میں وارڈ کا جائزہ لیا...... ہر کوئی اپنے دکھوں میں ڈوبا تھا۔

"کیا فیصلہ کیا؟" اسکی آواز محض سرگوشی تھی۔

"نہیں...... نہیں...... تم......"

فرشتے نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کر دیا...... پھر وہ عابد خان کا ہاتھ تھام کر اسے ساتھ لیکر ایک طرف چلا آیا۔

عابد خان کی گردن پر چیونٹیوں کا ایک بوجھل لشکر سرسراتا ہوا گزرے چلا جا رہا تھا۔

فرشتے نے ڈاکٹروں کے ریسٹ روم کے دروازے پر ٹھوکر ماری...... اب اس ویران کمرے میں وہ دونوں بالکل اکیلے تھے۔

"مجھے تم پڑھے لکھے سمجھدار آدمی لگے تھے...... سوچو' ٹھنڈے دماغ سے سوچو...... تمہارے والد ڈاکٹروں کے مطابق آدھا گھنٹہ پہلے مر چکے ہیں...... ہمارے کہنے پر انہیں آکسیجن کے زور پر چلایا جا رہا ہے...... نلکی کھینچنا ہے اور بس......"

عابد علی کا ذہن سن ہو گیا......

لبا...... میرا ماضی...... سب کچھ۔

فرشتہ رٹی رٹائی تقریر کر رہا تھا۔

"سب کچھ مٹی کے ساتھ مٹی ہو جائیگا...... صرف حشرات الارض عیش کریں گے۔ سمجھ سے کام لو۔ کتنے لوگ اس خوبصورت دنیا کی ایک جھلک دیکھے بغیر مر جائیں گے...... کسی کے بیٹھتے دل کی جگہ تمہارے والد کا دل زندگی کا پیغام بنے گا۔ دوسری طرف یہ صدقہ جاریہ ہے...... تم اپنے باپ کو جنت میں دیکھنا پسند نہیں کرے گے؟ میری مانو تو جسم سمیت سب کچھ بیچ دو...... خاصی رقم ملے گی...... اپنے بیوی بچوں کا خیال کرو......"

عابد خان ڈر گیا۔

"میں محلے میں کیا لے جاؤنگا؟ دفناؤں گا کیا؟ مجھے اور میرے بیوی بچوں کو اس آبادی میں رہنا ہے۔"

فرشتے کی تلخی رخصت ہو گئی اور اس کی مخصوص گیلی مسکراہٹ لوٹ آئی۔

"ٹھیک ہے...... جسم تم مٹی کے حوالے کر لینا۔"

فرشتے نے فائل سے ایک فارم نکالا' اور میز پر پھیلا دیا۔

"جسم چھوڑ کر باقی چیزوں پر نشان لگادو...... اور یہاں دستخط کرو"

عابد کی انگلیوں میں قلم تڑپنے لگا۔

"کسی کو پتہ تو نہیں چلے گا کہ......"

فرشتے کی مسکراہٹ پر جھلاہٹ نے جھپٹا مارا۔

"احمق...... مردے کی آنکھیں بند ہوتی ہیں...... انہیں کوئی کھول کر نہیں دیکھتا۔"

اس نے شہادت کی انگلی سے کن پٹی پر دستک دی...... اور پھر حاتم طائی کی قبر کھود کر مردے کو جھنجوڑ ڈالا۔

"چلو...... تمہیں ایک اور رعایت دیتے ہیں...... کیا یاد کرو گے...... یہیں غسل وغیرہ دیکر' کفنا کر' تمہارا باپ پوری طرح سے تیار تمہارے حوالے کر دیں گے...... فکر نہ کرو' کفن بھی نہیں کھولا جاتا...... آخر میت کی حرمت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

عابد خاں کی کھوپڑی میں لمبے لمبے دائروں میں اڑتی، چیختی چلاتی چیلیں سست پڑنے لگیں۔

فرشتے نے اسکے ہاتھ سے فارم لیکر فائل میں رکھا...... اور رومال سے ماتھے کے پسینے کو تھپک کر کرسی پر پھیل گیا...... اسکی مسکراہٹ بڑی آسودہ تھی۔

اس نے جیب سے نوٹوں کی تازہ، کلف لگی گڈی کھینچی اور گن کر پانچ نوٹ چھیلے۔

"یہ لو ایڈوانس...... گھر محلے میں اطلاع دے دو...... قبر وغیرہ کا انتظام کرو...... ٹھیک آٹھ بجے یہیں سے اپنی بقایا رقم اور اپنے والد صاحب کو لے جانا۔"

عابد خان کمرے سے نکل آیا...... اسکی جیب میں کرارے نوٹ اٹک رہے تھے۔

اس نے چاروں طرف چور آنکھیں پھرائیں...... سب کچھ ویسے کا ویسا تھا...... کچھ بھی تو نہ بدلا تھا۔

فرشتہ اس کے ساتھ جڑا کھڑا تھا...... عابد نے بلا سوچے سمجھے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"میں بابا کو آخری بار ایک نظر دیکھ سکتا ہوں......"

"کیوں نہیں...... زیادہ ٹائم نہ لینا...... ہمارے آدمی پہنچنے ہی والے ہونگے، مجھے سو فیصد یقین تھا کہ تم انکار نہیں کرو گے...... میں نے سارا انتظام پیشگی کر رکھا ہے۔"

بابا کی سانس ویسے ہی آکسیجن کے زور پر دھاڑیں مار مار کر چل رہی تھی۔ گلوکوز کی بوتل آخری دموں پر تھی۔

عابد خان بابا کے ماتھے پر بوسہ دینا چاہتا تھا...... وہ جھکا...... پھر ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔

اگر بابا نے آنکھیں کھول دیں تو......

وہ پلٹا اور اندھا دھند دوڑتا ہوا اسپتال سے باہر نکل گیا...... شہر باہیں کھولے اسکا منتظر تھا۔

اللہ کے بندے

مسجد کمیٹی کا اجلاس شروع ہونے والا تھا۔ سات ممبر آلتی پالتی مارے نئی خوش رنگ دریوں پر نیم دائرے میں بیٹھے تھے۔ سیکریٹری صاحب نے صدر صاحب سے اجازت لی اور کارروائی کا آغاز کیا۔

"اسلام و علیکم :۔ آپ حضرات کو ایجنڈے سے پتہ چل گیا ہو گا کہ آج کی یہ ہنگامی میٹنگ کس لئے بلانی پڑی ہے۔ میں آپ کو صرف تفصیلات سے آگاہ کرونگا۔ پھر ان کی روشنی میں آپ سب جو فیصلہ کریں گے اس پر عمل درآمد کیا جائیگا۔

آپ کو یاد ہو گا کہ کچھ عرصہ پہلے مسجد کی مرمت کروائی گئی تھی اور اس کے بعد جیسا کہ اکثر ہوتا ہے کچھ سامان بچ گیا تھا۔ میں نے اس کی پوری تفصیل آئیٹم وائز لکھ کر ریکارڈ میں محفوظ کر لی تھی۔ کچھ دن پہلے اچانک کسی ضرورت کے تحت مجھے اسٹور میں جانے کا اتفاق ہوا۔ دروازہ کھلتے ہی احساس ہوا کہ سیمنٹ کی پانچ بوریاں جو دروازے کی داہنی طرف ایک دوسرے کے اوپر رکھی رہتی تھیں، غائب ہیں۔

میں دروازہ لاک کر کے فوراً گھر گیا اور اپنا ریکارڈ والا کاغذ لیکر واپس آیا۔ ایک ایک چیز کو چیک کیا۔ چار بلاک کم تھے۔ ایک عدد بیلچہ نہیں تھا اور بوریوں کا ذکر تو میں کر ہی چکا ہوں۔ میں نے امام صاحب کو طلب کیا اور انہیں اس معاملے پر روشنی ڈالنے کو کہا۔ اس لئے کہ اسٹور کی ایک چابی میرے پاس اور ایک انکی تحویل میں رہتی ہے انہوں نے اس چوری سے مکمل طور پر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور الزام ان ہیرونچیوں پر لگایا جو پہلے بھی کئی بار خانہ خدا سے کبھی کلاک، کبھی ٹونٹیاں اور کبھی ٹیوبیں اتار کرلے جا چکے ہیں۔

بلاشک ایسے واقعات پہلے کئی بار پیش آچکے ہیں۔ ہم لوگ اس قدر گر چکے ہیں کہ خانہ خدا میں کچھ دینے کی بجائے اسے ہر لمحہ لوٹنے پر تلے بیٹھے رہتے ہیں۔ بہر حال اس واقعہ کی تفصیل پچھلی میٹنگ میں آپ کے گوش گزار کر دی گئی تھی۔ میں نے ریکارڈ میں اندراج کر لیا تھا کہ یہ اشیاء چوری ہو گئی ہیں اور ملزم نامعلوم ہیں۔ بات ختم ہو گئی۔

کل ایک شخص میرے پاس آیا اور مجھے الگ لے گیا۔ پھر وہ اچانک رونے لگا۔ روتے روتے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہ پا رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی، منگوا کر پانی پلوایا۔ جب اس کا دل کچھ ٹھہرا تو اس نے بتایا کہ مسجد سے جو پانچ بوریاں چوری ہوئی ہیں، وہ اس کے پاس موجود ہیں اور وہ انہیں واپس کرنا چاہتا ہے جب سے بوریاں اس کے گھر پہنچی ہیں اس پر خدا کا عذاب نازل ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اسے نیند کی نعمت سے محروم کر دیا ہے۔

جب میں نے اس سے واقعہ کی تفصیل جاننا چاہی تو اس نے صرف اتنا بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے اس کے پاس ایک ناواقف شخص آیا اور بولا کہ اس کے پاس کچھ سیمنٹ ہے۔ وہ اسے بازار سے خاصی کم قیمت پر بیچنے کو تیار ہے۔ لالچ اور دنیاداری ہماری رگ رگ میں بس گئی ہے اس نے بوریاں خرید لیں۔

میں نے ہر طرح سے کوشش کی کہ وہ اس خدا اور قانون کے مجرم کا اتا پتہ بتائے جس نے اپنے ساتھ اسے بھی گناہ کی دلدل میں دھکیل دیا تھا لیکن وہ مسلسل حیلے بہانے کرتا رہا۔ پھر میں نے مسجد سے کلام اللہ اٹھایا اور اس کے سر پر رکھ دیا اب اس کے پاس کوئی چارہ نہ

تھا۔ وہ پھر سے دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ میں جانتا تھا کہ یہ مگر مچھ کے آنسو ہیں اس لئے اب کے میں نے اسے ہمدردی اور تسلی کا ایک لفظ بھی نہ کہا۔ پھر اس نے مجرم کا نام بتا دیا۔

نام جان کر میری گردن جھک گئی۔ اور میری آنکھوں کے سامنے جہنم کا نقشہ آگیا' میں خوف خدا سے لرزنے لگا کہیں عذاب الٰہی مجھے بھی اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔

میں نے اسی وقت مجرم کو بلایا اور دونوں کو آمنے سامنے کر دیا۔ مجرم نے اپنے گناہ کا اقرار کر لیا اور وہ بھی روتا جاتا تھا اور اپنے گناہ کی معافی طلب کرتا جاتا تھا۔ میں نے دونوں کو بھجوا دیا اور یہ ہنگامی میٹنگ طلب کر لی۔ ایک بات اور۔ بوریاں مسجد میں پہنچ گئی ہیں اور اسٹور میں بالکل محفوظ ہیں۔ اب اگر بات یہاں تک ہی ہوتی تو میں آپ کو زحمت نہ دیتا اور معاملے کو یہیں ختم کر دیتا۔ خدا تعالےٰ کے گھر کا مال واپس پہنچ گیا تھا۔ لیکن اس میں ایک پیچیدگی ہے جو میں اکیلا حل نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے کبھی بات کھلتی تو آپ حضرات مجھے مورد الزام ٹھہراتے۔ اب میں مجرم کا نام لئے دیتا ہوں اس مسئلے سے جو مزید مسائل پیدا ہو سکتے ہیں ان پر آپ غور کر سکیں۔

یہ بوریاں ہمارے امام صاحب نے بیچیں تھیں۔

وہ اپنی غلط کاری پر نادم ہیں۔ انہوں نے اپنی مجبوریوں کا بھی ذکر کیا ہے ان کی زوجہ محترمہ پچھلے تین مہینے سے مسلسل علیل ہیں۔ ان کے دوا دارو پر خاصا خرچہ اٹھ رہا ہے۔ اس کے علاوہ بقول ان کے انکی تنخواہ بھی قلیل ہے اور بار بار درخواست گزارنے کے باوجود مسجد کمیٹی نے اس سلسلے میں ان کے لئے کچھ نہیں کیا۔ چوری اور سینہ زوری۔

اب بحث اس بات پر کرنا ہے کہ کیا امام صاحب کا اب بھی اس عہدہ جلیلہ پر متمکن رکھنا جائز ہے یا نہیں۔ نمبر دو کہ اس دوران ہم نے جو نمازیں انکے پیچھے پڑی ہیں' ان کی کیا حیثیت ہے کیا ہے۔ وہ ہوئیں یا نہیں ؟

خاصی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ سارے ممبران کو اس واقعہ سے ذہنی اور روحانی صدمہ پہنچا تھا۔ ابھی وہ اس صدمے سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے کہ صدر صاحب گویا ہوئے۔

حضرات میں کیا عرض کروں۔۔ مجھے تو عرش کے کنگرے ہلتے ہوئے نظر آرہے ہیں کہیں یہ نہ ہو کہ ہم پر من حیث القوم کوئی بڑا عذاب نازل کر دیا جائے۔ جیسا کہ ہم سے پہلے گمراہ قوموں پر کیا گیا۔ میری ناچیز رائے میں اب نجات کا ایک ہی راستہ ہے کہ امام کو فوری طور پر برطرف کر دیا جائے۔۔ شاید اس طرح سے ہم اس عذاب سے بچ جائیں۔ باقی رہا نمازوں کا مسئلہ تو اس پر کسی معروف عالم دین سے فتویٰ حاصل کیا جائے۔"

ایک بار پھر خاموشی چھاگی...... پھر نظریں ملیں اور معاملہ تقریباً طے پا گیا۔

ایک نسبتاً کم عمر ممبر جو بہت مودب بیٹھا تھا اور بولے جانے والے ہر لفظ کو جذب کر رہا تھا' اپنی سیاہ ڈاڑھی کھجاتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے گلہ صاف کیا اور بڑی مشکل سے اس کی آواز بر آمد ہوئی۔

صدر صاحب نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا لیکن پھر وسعت قلب کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بولنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

"چھوٹا منہ بڑی بات...... آپ لوگوں کی موجودگی میں گفتگو کرتے ہوئے حجاب سا آرہا ہے۔ اس سے پہلے کی میٹنگوں میں ہمیشہ خاموش سنتا رہا اور اپنے علم اور تجربے میں اضافہ کرتا رہا۔ میں آج بھی نہ بولتا لیکن میری زبان قابو سے باہر ہوئے جارہی ہے۔ بہر حال اگر حماقت کی کوئی بات سرزد ہو جائے معاف فرمادیجئے گا۔

امام صاحب کی تنخواہ واقعی قلیل ہے۔ اس میں ایک سفید پوش انسان کا باعزت طور پر زندہ رہنا ناممکن ہے۔ اور پھر انسان خطا کا پتلہ ہے۔ اب اگر اس وقت امام صاحب کو برطرف کر دیا گیا تو وہ اپنے بچوں اور بیمار اہلیہ کو لے کر کہاں جائیں گے۔ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ان کی مجبوریوں کا بھی خیال کرنا چاہیئے۔ شیطان کسی بھی وقت کسی کو بھی بہکا سکتا ہے۔ میں ایک بار پھر اپنی اس جسارت کی معافی چاہونگا۔ میری ایک درخواست ہے۔ اگر آپ لوگ مناسب جانیں تو ہم سب خدا تعالےٰ کے حضور سجدہ ریز ہوں اور غفور الرحیم کو اپنی شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب محسوس کر کے اپنا فیصلہ دیں۔"

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر سب کے دماغ میں ایک ہی بات

آئی۔ یہ نوجوان مسجد کی آمدن کا سب سے بڑا ذریعہ ہے...... صبح سے شام تک گھر گھر جاتا ہے......لوگوں کی گھر کیاں سہتا ہے...... کبھی کبھی تو بے عزت بھی کیا جاتا ہے...... لیکن اپنی دھن کا پکا ہے...... مسجد کی تعمیر میں سب سے زیادہ اس کا حصہ ہے......اس کی بات میں وزن ہے۔

پھر اللہ اکبر کہہ کر ساتوں ممبران سجدے میں گر گئے۔ اور خداوند کریم کو اپنی شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب محسوس کر کے اس کی ہدایت کے منتظر رہے۔

پھر جب اٹھے تو طے ہو گیا کہ امام صاحب کی یہ پہلی خطا ہے اور وہ بھی مجبوری کے تحت' اس لئے انہیں معاف کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ بھی انہیں معاف فرمائے۔ اس کے بعد میٹنگ برخواست کر دی گئی۔ امام صاحب کی تنخواہ میں اضافے کی کوئی بات نہ ہوئی۔ اس لئے کہ اس سے کہیں کم تنخواہ پر امام مسجد دستیاب ہے اور دوسرے یہ کہ مسجد کی مالی حالت اتنی اچھی نہ تھی۔

امام صاحب کو جب یہ خبر سنائی گئی تو انہوں نے آنسوؤں کی آبشار سے سب ممبران کا فرداً فرداً ان کے گھروں پر جا کر شکریہ ادا کیا اور پھر اپنی مستقل مریضہ بیوی کے سرہانے بیٹھ کر ان لوگوں کی عظمت اور فراخ دلی کی کہانی سنائی۔

امام صاہب جن گھروں میں بچوں کو قرآن شریف پڑھاتے تھے' وہاں سے پیشگی لے کر گزارا کرتے رہے۔ زندگی کا ایک دن طلوع ہوتا تو اس کے بعد گزر جانے کی دعا کرتے اور آنے والے دن سے امیدیں باندھ کر تھوڑا سا اور جی لیتے...... جمعے کے خطبے میں اسلاف کی عظمت اور دنیا سے بے نیازی کے واقعات سناتے۔ خود بھی بار بار آب دیدہ ہو جاتے اور سننے والوں کو بھی رلاتے۔

پھر ایک دن اچانک اسٹور روم سے دو عدد بجلی کے نئے پنکھے غائب ہو گئے۔

کسی اللہ کے نیک بندے نے اپنی عاقبت سنوارنے کو یہ پنکھے مسجد کو دیئے تھے۔ ان کی ضرورت نہ پڑی' اس لئے ایک عرصے تک اسٹور میں رکھے رہے۔ چلتا ہوا کوئی پنکھا خراب ہوتا تو ان کی باری آتی لیکن اللہ کے گھر میں کوئی پنکھا خراب ہو کر نہ دیا۔

ایک بار پھر مسجد کمیٹی کی ہنگامی میٹنگ طلب کی گئی۔ سیکریٹری نے معمول کے مطابق صدر صاحب کی اجازت سے ابتدا کی۔

"حضرات مجھے ایک بار پھر بڑا ہی کٹھن فریضہ ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ پچھلے واقعہ کے بعد میں ہر جمعہ کی شام کو اسٹور میں رکھی اشیاء کی خود گنتی کرتا ہوں۔ اللہ کے مال کی حفاظت کی ذمہ داری ہم پر اپنے جان و مال سے زیادہ ہے۔ اس میں کوتاہی نہیں ہونا چاہئے کل شام دو عدد پنکھے غائب پائے گئے۔ میں نے امام صاحب سے گفتگو کی ہے لیکن انہوں نے حسب معمول اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ مومن ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا۔ میری ناچیز رائے میں امام خدا کے گھر کی محافظت کے قابل نہیں رہے۔ وہ دنیادار بندے ہیں۔ ان کا نفس ان پر بری طرح سے حاوی ہے بوری والا قصہ ہم نے دبا دیا تھا۔ یہ واقعہ بھی باہر نہیں جانا چاہئے ۔عام آدمی پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔ جب انہیں پتہ چلے گا کہ خود امام مسجد ایسے کاموں میں ملوث ہیں تو اسکا مذہب پر سے اعتماد متزلزل ہو جائیگا۔ آپ جانتے ہیں ویسے ہی لوگ آج کل مذہب سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔"

سب ممبران نے ایک دوسرے کی فکر مند آنکھوں میں جھانکا فیصلہ متفقہ جا رہا تھا کہ وہ نسبتاً نوجوان ممبر پھر بول اٹھا۔ یہ واقعہ بھی اتنا ہی افسوس ناک ہے جتنا کہ بوریوں والا تھا۔ لیکن اس بات پر توجہ دی جائے کہ اب کے امام صاحب پر الزام ثابت نہیں ہوا۔ انہوں نے خود بھی اقرار نہیں کیا اور کوئی شہادت بھی موجود نہیں۔ میری رائے ہے کہ ہم ایک بار پھر اللہ کے حضور میں سجدہ ریز ہوں اور اسے حاضر جان کر بلحہ محسوس کر کے غور کریں، تب اپنا فیصلہ دیں۔

صدر صاحب کی کشادہ پیشانی پر محراب پھڑکنے لگا۔ یہ شخص کم از کم سو دروں کا مستحق ہے انہوں نے بڑی محنت کر کے اپنے بگڑتے چہرے پر پر شفقت مسکراہٹ اوڑھ لی۔

میاں تم ابھی کم عمر ہو...... تم نے ابھی زندگی کو چکھا ہے، برتا نہیں...... مجرم امام صاحب ہی ہیں۔ گواہ ان کے گھریلو حالات ہیں۔ ان کی پچھلی چوری ہے۔ اور وہ قرض خواہ ہیں جو دن بھر ان کے حجرے کی کنڈی بجاتے رہتے ہیں۔

حضرات...... میں سیکریٹری صاحب سے اتفاق کرتا ہوں...... امام کو برطرف کردیا جائے...... ابھی' اسی وقت انکا سامان باہر پھینک دیا جائے...... ساتھ ہی نئے امام صاحب کی تلاش شروع کردی جائے۔ اس دوران میں جماعت کرانے کی ڈیوٹی دیتا رہا ہونگا۔ کس کو اگر اعتراض ہو تو......"

"اس شخص کا ہاتھ پھر اٹھ گیا۔

آپ جیسے نیک نفس اور پرہیزگار بزرگوں سے اختلاف کرنا گناہ کے مترادف ہے۔ لیکن میری ایک چھوٹی سی گزارش ہے۔ امام صاحب پریشان حال ہیں۔ انہیں کچھ رعایت دی جائے' کچھ وقت دیا جائے تاکہ وہ اپنے لئے کوئی ٹھکانہ ڈھونڈھ سکیں۔ ان کی اہلیہ......"

سب کی نظریں ایک بار پھر صدر صاحب کی طرف اٹھیں...... وہاں پتھریلہ انکار تھا...... وہ خدا کے مجرم کو سانس کی رعایت دینے کو بھی تیار نہ تھے۔

سب ہاتھ اٹھ گئے...... وہ شخص ہاتھ اٹھا کر خود بھی اٹھا اور مسجد سے باہر چلا گیا۔

صدر صاحب کی آواز میں اللہ سے عذاب مانگنے والی کڑک تھی۔

مجھے ان صاحب کے خیالات ٹھیک نہیں لگے۔ ہمیں یہ بھی نہیں پتہ کہ ان کا تعلق کسی مسلک سے ہے۔ کل کلاں یہ نہ ہو کہ ہم بے خبری میں مارے جائیں اور ہمارا اللہ کا گھر کسی اور کے ہاتھ میں چلا جائے۔ میری تجویز ہے کہ انہیں مسجد کمیٹی کی ممبر شپ سے ہٹادیا جائے تو بہتر ہے۔

"وہ ذرا دیر کور کے پانچوں ممبران کے چہرہ پڑھے۔

میں جانتا ہوں آپ کے دلوں میں کیا ہے...... یہ سب سے زیادہ چندہ جمع کرتے ہیں؟ مسجد کی تعمیر ان ہی کی مرحون منت ہے؟ لیکن ہمیں صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہئے اس سے مدد مانگنی چاہئے۔ یہ گھر اس کا ہے۔ وہ وہی اس کا نگہبان ہے۔ وہ ہی اسے قائم و دائم رکھے گا۔" صدر صاحب خاموش ہوئے تو پانچ ہاتھ فضا میں بلند ہوئے۔ صدر نے بھی اپنا ہاتھ اٹھایا۔ اور پھر کندھے پر لٹکتے ہوئے ریشمی رومال سے آنکھیں پونچھنے لگے۔

نائٹ میر (NIGHTMARE)

دور افق پر منڈلاتی دھند بہت پہلے چھٹنے لگی تھی...... اسکی نظریں اپنے بھاگتے پیروں پر جمی تھیں......

پھر ایک دن اچانک دوسرا کنارا بالکل صاف' سامنے نظر آنے لگا۔

اتنا کم فاصلہ !اتنی جلدی!

انجائنا...... آسمان کو ٹکریں مارتا بلڈ پریشر......

بڑا امریکہ میں ایم' بی' اے کر رہا ہے...... چھوٹا میڈیکل اور گڑیا آرٹس کالج میں...... اب تک سب گھٹنوں پر رینگ رہے ہیں...... کوئی بھی پیروں پھر کھڑا نہیں ہو پایا۔

اس کی جھنجلاہٹ بچھو ہو گئی تھی...... وہ اپنے سمیت ہر کس کو ڈنکنے لگا تھا۔

اس کے اندر ایک طویل عرصے سے مدفون چیخیں جھنڈ کی صورت کلبلاتی ہوئی اٹھیں اور آسمان تک جا پہنچیں۔ اور پھر اس پر کنکریوں کی طرح برسنے لگیں...... وہ خلیہ خلیہ چھور رہا تھا۔

اتار دو سب کچھ...... سب کچھ پھینک کر الگ ہو جاؤ۔

سفید اکڑی ہوئی قمیض گہرے رنگ کا ماتمی ایگزیکٹو سوٹ' گلے میں تمالتے رنگوں کا پھندہ...... اور بے زبان پاؤں...... بیپاروں نے ایک عمر موزوں جوتوں کے عذاب میں گزاری ہے۔

سب کچھ کیسے اتار پھینکوں!

میرے اردگرد' ہر طرف آنکھوں والی دنیا بستی ہے...... مجھ میں اور جانوروں میں کیا فرق رہ جائیگا۔

اس نے چور نظروں سے ماحول کا جائزہ لیا...... کوئی نہیں دیکھ رہا تھا...... کسی کو فرصت نہ تھی۔

اس نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی...... قمیض کا اوپر والا بٹن کھولا...... پھر ایک طویل سانس کھینچی......اور جوتے موزے بھی الگ کر دیئے۔

پھر اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے آپ کو سوالا۔

اسے شدید مایوسی ہوئی......ابھی تک کوٹ پتلون اسکے اوپر لدا ہوا تھا۔

وہ گھر آیا اور سیدھا غسل خانے میں گھس گیا۔

ایک ایک کپڑا اتارا اور اندر دروازے کے پیچھے الگنی پر لٹکانے کی بجائے' بنڈل بنا کر باہر بیڈ روم میں پلنگ پر اچھال مارا۔

اس نے اپنے برہنہ جسم کا ایک عرصے بعد بغور جائزہ لیا......اندر ہی اندر خاصی بے مروت ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی......

اب تو میرا جسم آزاد ہے!

ایک بے رحم صدا معنی خیز قہقہہ بن کر اس کے اندر پاؤں پٹخنے لگی۔

"تمہارے اردگرد لوہے اور کنکریٹ کی مضبوط دیواریں ہیں......ان دیواروں کے باہر آسمان سے گلے ملتی فصیلیں ہیں...... تم اس حصار میں بند ہو۔"

اس نے سر شاور کی تیز بوچھاڑ کے نیچے رکھدیا۔

وہ دوہرے خوف کے جبڑوں میں پس رہا تھا...... حصار کی دیواریں تنگ ہو کر مل

جائیں گی یا پھر وہ سر بازار ننگا ہو جائیگا۔

پھر یہ عذاب انتظار کے بند توڑ کر آزاد ہو گیا۔

اس نے اپنی بیوی کو اعتماد میں لینا چاہا۔

بیچ......؟

"سنو......"

بیگم نے اس کی طرف دیکھے بغیر انڈا توڑا اور گنگناتے فرائینگ پین کی نذر کر دیا۔

اس نے ایک اور کوشش کی۔

"میں بہت پریشان ہوں۔"

بیگم نے مار دھاڑ کرتا چمچ روک کر بس ایک نظر کی زحمت کی۔

"بچوں کو دیر ہو رہی ہے"

وہ اپنے سلگتے بائیں بازو کو نچوڑتا ہوا چیخ اٹھا۔

"میں مر جاؤں گا"

بیگم نے فرائینگ پین چولہے سے اتار پٹخا۔

"صبح کی گولیاں لینا بھول گئے ہو گے! کبھی کچھ خود بھی......"

تھو تھو کرتی جھنجلاہٹ سے بیگم کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا......وہ کھٹ کھٹ فرش کوٹتی کچن سے نکل گئی۔

اف......پچیس سال......ایک چھت کے نیچے...... تین بچے پیدا کئے اور یہ اجنبی دشمن عورت......

بیگم پانی کے گلاس اور گولیوں کے ساتھ واپس لوٹ آئی۔

"میں نے لے لی تھیں......تم کہتی ہو تو پھر لے لیتا ہوں۔"

بیگم کا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔

"تمہیں مجھے اذیت دینے میں لطف آتا ہے۔"

اس نے پانی کا گلاس جھپٹ کر اندر انڈیل لیا۔

"مجھے تم سے مشورہ کرنا ہے"

بیگم نے اسکے مستقل گھمبیر لہجے کے زیر اثر جھلاہٹ کے غبارے میں سے جھانکا۔

"جلدی کہو......"

"اگر میں کچھ عرصے کے لئے کہیں چلا جاؤں تو......"

"یہ تم کہہ رہے ہو؟ دفتر تمہیں چھوڑے گا؟ تمہارا باس......"

پھر بیگم کی کرخت آواز میں گم شدہ ملائمت کا پھیکا سا سایہ ابھرا۔

"ٹھیک ہے...... کچھ دن کے لئے ملتان ہو آتے ہیں۔ بھائی جان عرصے سے تقاضہ کر رہے ہیں۔ بچوں کے امتحانات ہو جانے دو۔"

اس کے ہاتھ بیگم کا گلا دبانے کے لئے ضد کرنے لگے...... اس نے اپنی پانی سے پتلی ول پاور کے زور پر انہیں روک لیا...... پھر ول پاور کے ایک اور جھٹکے سے چہرے پر مسکراہٹ مسلط کرنے کی کوشش کی۔

وہ بری طرح سے لرز رہا تھا...... سانس اڑیل ٹٹو ہو گئی تھی۔

اس سے پیشتر کہ اس کی مسکراہٹ دم توڑ دے...... اس نے پلٹ کر بریف کیس اٹھایا اور باہر نکل گیا۔

کمرے کے دروازے پر چپراسی نے معمول سے لمبا سلام مارا اور ہونٹ دبا کر بڑے صاحب کا پیغام پہنچایا۔ اس نے بریف کیس میز پر پٹخا...... ٹائی کی گرہ کو مزید کھینچا اور صاحب کے کمرے کی طرف لپکا۔

پہلی ہی دستک پر شہد میں گھلے تحکم نے اسے اندر بلا لیا۔

"آصف صاحب...... خیریت؟ کوئی بڑا حادثہ ہوا ہو گا جو آج کل آپ لیٹ آرہے ہیں۔"

وہ خاموش رہا...... اس کا بایاں بازو پھر تڑپنے لگا تھا

ابرو کے آخری کونے کے اشارے پر کرسی کھینچی اور سمٹ کر بیٹھ گیا۔

صاحب نے قلم سنہری قلمدان پر چڑھایا اور کھلی فائل بڑھا دی۔

"ہلٹن والوں کا آرڈر سرو نہیں ہوا...... کینسل کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں...... ایسے فرم کیسے چلے گی؟"

وہ چپ چپ فائل پر رینگتے کیڑوں مکوڑوں کو گھورتا رہا۔

صاحب کی آنکھوں میں پریشانی کا ہلکا سا بھور اٹھا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟ آپ کا چپراسی کچھ کہہ رہا تھا۔"

وہ اب بھی کچھ نہ بولا...... اس کے ذہن میں بکھرے الفاظ ایک ساتھ جڑنے سے انکاری تھے۔

اس کا لباس تنگ ہونے لگا......

وہ سہم گیا...... اگر اس کی سانس رک گئی اور وہ عین ہلٹن والی فائل کے اوپر گر کر مر گیا تو کیا ہوگا!

اچانک ایک ملائم آواز نے اسے سمیٹ لیا۔

"آپ فرم کے پڑنے اور بااعتماد و ملازم ہیں...... ہم آپ کو کھونا نہیں چاہتے...... اگر کوئی پریشانی ہے تو مجھ سے شیئر کریں۔"

وہ اچانک جڑنے لگا...... ذہن کے اندر کھٹ پٹ ہوئی...... بہت کچھ الٹا پلٹا...... پھر خالی جگہیں پر ہونے لگیں...... بائیں ناراض بازو کی خفگی بھی کم ہونے لگی۔

"سر مجھے چھٹی چاہئے...... میں نے اپنی پوری ملازمت کے دوران کبھی چھٹی نہیں لی۔"

صاحب کی پریشانی چھٹ گئی۔

"بس اتنی سی بات! کتنی چاہئے؟ کب چاہئے؟ ہلٹن کا کیس میں خود ڈیل کرلونگا۔"

وہ کرسی سے اٹھ گیا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

لمبی...... ہمیشہ کے لئے......

صاحب کا دماغ اور آنکھیں تھوڑی دیر تک معمہ حل کرنے میں لگے رہے۔

"نہیں جلدی نہ کریں...... ابھی چھٹی لے لیں...... پھر واپسی پر فیصلہ کریں

گے۔"

اس کے سینے پر رکھا پہاڑ ذرا سا اوپر اٹھ گیا...... اسے اپنی حماقت کا احساس فوری طور پر ہو گیا تھا۔

"اس طرح یک لخت ملازمت کیسے چھوڑی جا سکتی ہے...... بڑا' چھوٹا اور گڑیا...... انجائنا...... بلڈ پریشر......

اس نے بیگم کو صرف اتنا بتایا کہ وہ کمپنی کی طرف سے کچھ دنوں کے لئے کراچی جا رہا ہے۔

طویل سفر کے دوران وہ کھلی کھڑکی کے راستے باہر بکھری دنیا کو چوستا رہا...... حد نظر تک پھیلے ہرے' سوکھے کھیت 'نہریں' دریا...... ٹیلی فون کی تاروں پر بیٹھی لمبی دم ہلاتی چڑیا...... پھر منظر بدل گیا...... لق و دق صحرا گرم ریت کے چھینٹے 'کیکٹس کے اجاڑ درخت اور پھر ٹرین کی مسلسل کھٹ کھٹ۔

رات سوتے جاگتے میں اسے کئی بار احساس ہوا کہ وہ بالکل برہنہ ہے اور اس کا وزن اتنا کم ہو گیا ہے کہ وہ سیٹ کی بجائے چھت سے چپکا ہوا ہے۔

ٹیکسی گنجان انسانی جنگل میں بلبلاتی گھٹنوں گھٹنوں رینگ رہی تھی...... آہستہ آہستہ جنگل چھدرا ہونے لگا اور پھر اچانک ختم ہو گیا۔

اس نے اچک کر سمندر کی ایک جھلک دیکھنے کی کوشش کی...... ہٹوں (HUTS) کی لمبی دیوار کے پیچھے روشنی اور تاریکی آپس میں دست و گریباں تھے...... اسے کچھ دکھائی نہ دیا...... وہ ابھی تک اندھا تھا۔

ٹیکسی ہوٹل کے دروازے پر رکی...... انجمن بند ہوا تو اچانک سمندر کا شور سنائی دینے لگا...... اس نے دونوں کان لگا دیئے...... زمین کی کوکھ سے اٹھتے ہوئے اس شور نے اس کے اندر ہزاروں پاگل' سر پیٹتی آوازوں کو نگلنا شروع کر دیا۔

کونٹر کلرک پورے انہماک سے پیشنس (PATIENCE) کھیل رہا تھا۔

اس نے گڈی ایک طرف رکھی اور جلدی سے چہرے پر مسکراہٹ چڑھا لی۔

"خوش آمدید سر......"

"ہوٹل خالی خالی لگ رہا ہے...... یہاں تو ایک ہجوم ہونا چاہئے۔"

کلرک کی ہنسی حلق میں گڑگڑا کر رہ گئی...... وہ سر جھکا کر رجسٹر میں اندراج کرنے لگا۔

کمرے میں آکر اس نے کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔

باہر مکمل تاریکی تھی......

وہ ایک طویل عرصے بعد موت نیند سویا۔

صبح اٹھ کر اس نے اپنے بائیں بازو کو ٹٹولا...... پھر اسے ہلا جلا کر دیکھا...... کہیں کوئی درد تھا نہ ناراض زندگی کی چیخیں۔

وہ لپک کر کھڑکی میں آکھڑا ہوا۔

دور دھند سے افق پر آنکھیں بچ مچاتے سورج کی جاتی کرنیں اور ان میں کھیلتا سمندر۔

اس کا جی چاہا کہ وہ یہیں سے چھلانگ لگا دے۔

وہ گول چکر دار سیڑھیوں پر جھومتا ہوا اترا اور چابی کاؤنٹر پر رکھ دی۔

کونٹر کلرک نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

"سر...... خوش گوار موسم مبارک...... آپ ناشتہ نہیں...... ؟ دوپہر کے کھانے پر کیا کھائیں گے ؟"

اس نے کلرک کی مسکراہٹ اسے واپس لوٹائی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

وہ پانی کے ساتھ ساتھ گیلی ریت پر چلتا چلا گیا۔

اس کے جوتوں میں ریت کلبلانے لگی...... اس نے جوتے موزے اتار کر پھینک دیئے...... پھر اچانک اس کے ہاتھ بے قابو ہو گئے...... ٹائی، کوٹ، قمیض بنیان اور آخر میں پتلون...... اس نے گٹھڑی بنا کر سب کچھ سیاہ چٹانوں کی طرف اچھال دیا۔

شام کو ہوٹل کا پریشان کلرک اسے ڈھونڈنے نکلا۔

سیاہ چٹانوں کے پیچھے کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ان پر ریت جم گئی تھی......بپھرا ہوا سمندر سیاہ چٹانوں پہ کچھ بے ترتیب تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا...... ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ انہیں بہت جلد نگل جائے گا۔

بدمعاش

سوزی سر سے پاؤں تک اکھڑی اکھڑی تھی۔

اس کے اندر کئی دنوں سے مسلسل ہونے والی کھٹ پٹ پاؤں پٹختی باہر آگئی۔

اف...... رات بھر بپھے معدے کی بدبودار پھنکاریں...... ڈبلیو سی (WC) کی گھٹی گھٹی ہچکیاں...... وقفے وقفے سے چیپ قسم کی چٹاخ پٹاخ۔

ممی کو کیا ہو گیا ہے...... ممی ایسی گئی گزری تو نہیں تھی۔

ایک دم گنجا سر، لیجلی گیلی آنکھیں...... دو پیگ کے بعد آدمی سر کے بل الٹا کھڑا ہو جائے...... لور (LOVER) ایسا بھی ہو سکتا ہے! او گاڈ!

اچانک لمبے تڑنگے شراف کی بدمعاش مسکراہٹ اس کے رخساروں پر پھیلتی اسکے ہونٹ چاٹنے لگی۔

سوزی نے جلدی سے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر اپنا آپ چھپالیا۔

سر کے بالوں میں برش خاصی بے دردی سے مار دھاڑ کر رہا تھا۔

ممی سہمی ہوئی ٹھٹھکتی 'بڑتی آئی اور چائے کی پیالی میز پر رکھ دی۔

سوزی کے اندر کلبلاتی حقارت نے ہونٹوں کی باڑ توڑ ڈالی۔

"ممی...... تمہارا نیا لور (LOVER) مجھ کو ایک دم اچھا نہیں لگا۔"

ممی نے ایک نظر سوزی کے چٹختی کلی بدن پر ڈالی...... پھر سر جھکا کر چہرے کو چاٹتے بڑھاپے کو آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔

سوزی کھٹ کھٹ سیڑھیوں کو روندتی نیچے اتری اور کمپاؤنڈ سے باہر مین روڈ پر آکھڑی ہوئی۔

دھوپ ابھی سے کاٹنے لگی تھی۔

"صبح ہی صبح سورج بھی مردانگی دکھانے پر تل گیا ہے"

سوزی نے اپنی تتلی چھتری کھولی اور عین سورج کی آنکھوں میں جھونک دی۔

سڑک پر اندھی گاڑیاں ناک کی سیدھ دوڑے چلی جا رہی تھیں۔

چانک سڑے ٹماٹر رنگ کی ڈاٹسن ہانپتی کانپتی فٹ پاتھ سے آلگی۔

کھڑکی میں بیٹھا شراف اسے دانتوں تلے لچکچا رہا تھا۔

سوزی بھڑک اٹھی۔

"شیطان تم یہاں بھی؟" سوزی نے جلدی سے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔

شراف کے سفید موتیوں جڑے جبڑے پورے کھل گئے۔

"سوزی ڈیئر...... میں ہر جگہ موجود ہوں 'زمین پر...... آسمان پر...... ہوا میں...... تمہارے اندر......"

پھر اس نے زندگی سے بھرپور قہقہہ لگایا۔

"کیوں اس سڑی دھوپ میں اپنا خوبصورت جسم گلا رہی ہو؟ بہت جلدی بوڑھی ہو جاؤ گی...... پھر میرے جیسا لور (LOVER) نہیں ملے گا...... اچھی بچی کی طرح آجاؤ...... میں تمہیں دفتر ڈراپ کر دونگا۔ بعد کی بعد میں دیکھیں گے۔"

سوزی نے خوب لمبی زبان نکال کر اس کا منہ چڑایا۔

شراف کی مسکراہٹ نے سنجیدگی اوڑھ لی۔

"سوزی ڈیئر...... کوئی بات نہیں...... میں تمہارا انتظار کرلونگا حالانکہ انتظار کا مطلب زندگی ضائع کرنا ہے۔"

گاڑی ہنہنائی اور جھٹکے کھاتی آگے بڑھ گئی...... دھوئیں کا غبار سوزی کے نتھنوں کو چھیل گیا۔

"سالا حرامی............ ایک دم سے لوفر۔"

دھوئیں کا غبار ہوا میں تحلیل ہوگیا۔

"سالا ایک دم ہینڈسم ہے۔ اندر تک چبھ جاتا ہے............ لیکن............

گلی سے آتے ہوئے رکشے کی بڑبڑاہٹ نے اس کے ذہن کے سامنے دیوار کھڑی کردی۔

موڑ پر رکشا آہستہ ہوتے ہی وہ اندر کود گئی۔

آج سارا شہر صرف اس کے دفتر میں فون کر رہا تھا...... سوزی ایک کال نپٹاتی تو تین مزید بلب اسے آنکھیں مارنے لگتے...... مسلسل پیں پیں نے اسے شہد کی مکھیوں کے قبیلے میں شامل کردیا تھا۔

عذرا نے اسے کندھا پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"اپنے بقیہ لورز کو واپس آکر نپٹا لینا...... پیٹ ٹھائیں ٹھائیں کر رہا ہے۔"

سوزی سوچ بورڈ کو روتا پیٹتا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی...... اس نے عذرا کا بڑا بے باک جائزہ لیا۔

قبر سے تازہ لمبا مردا ابھی اٹھ کر آیا ہے...... سفید کاٹن کی جھاگ ساڑھی میں ابھی بل نہ پڑے تھے۔

سوزی نے اسے آنکھ ماری۔

"چھوڑو...... پرانے کا رونا چھوڑو...... بڑا بد نصیب تھا۔ تم پر تو روز دو چار مرد وار کر پھینکے جا سکتے ہیں...... آج باس کا بلاوہ نہیں آیا؟"

عذرا نے شکر ادا کیا کہ حال خالی ہو چکا تھا۔

"اللہ کی بندی...... بولنے سے پہلے آس پاس تو دیکھ لیا کر۔"

عذرا نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"آج شراف سے ملاقات نہیں ہوئی؟"

سوزی چلتے چلتے جھٹکے سے رک گئی۔

"وہ بدمعاش آج کمپونڈ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا پڑے گا۔"

سوزی کے چہرے پر کھلی شوخی مرجھا گئی۔

"کیا ہوا؟ خیریت؟"

"یار...... وہی ممی کا پرابلم۔"

"اپنی ممی کا پیچھا چھوڑ دو...... اپنی فکر کرو۔"

دونوں ڈائننگ ہال کے ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔

سوزی کھانے پر ٹوٹ پڑی...... عذرا نے اسے ٹوکا۔

"ساری محنت برباد کر لو گی۔"

"عذرا...... آج مجھے مت روکو...... میں ہر سامنے آنے والی چیز کھا جاؤں گی۔"

بڑی مشکل سے اس کا تنا ہوا چہرہ کچھ ڈھیلا پڑا۔

"تمہیں بھی......"

پھر اچانک اس لئے ایک بے جڑ قہقہہ لگایا...... لیکن اس کے اندر الجھی گانٹھ ڈھیلی ہو کر نہ دی۔

کھانے سے فارغ ہو کر دونوں واپس شیشے کے قید خانے میں لوٹ آئیں۔

سوزی پھر سے سوچ بورڈ (SWITCH BOARD) میں دفن ہو گئی۔ مسلسل پیں پیں۔ جلتے بجھتے بلب آوازوں کا مصنوعی جنگل۔

بہت دیر بعد ایک بار پھر عذرا ہی اسے جھنجھوڑ کر واپس زندوں کی دنیا میں واپس لائی۔

"سوزی دیکھ تو...... بارش ہونے والی ہے۔"

وہ جھک کر آسمان پر پھیلے شرابیوں جیسی بدلیوں کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

موسم اچانک بدل گیا تھا...... ٹھنڈی بھی ہوا شیشے کے قبرستان کے اندر بھی محسوس ہونے لگی تھی۔

سوزی چڑ گئی۔

"سالوں بوند نہیں پڑتی...... اب بارش ہو گی تو آدھا شہر تیرنے لگے لگااور باقی آدھا ڈوب جائیگا...... اور ہمارا فلیٹ کئی دن تک منہ بسورتا روتا رہے گا۔"

عذرا نے سوزی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"امن...... سوزی امن...... تم ہر وقت ہیومن ٹارچ (HUMAN TORCH) کیوں بنی رہتی ہو؟ بڑی جلدی یہ ننھی سی جان جل کر راکھ ہو جائیگی۔"

سوزی کھلکھلا کر ہنس پڑی...... اتنی دیر میں نیا موسم اس تک پہنچ گیا تھا۔

پھر اچانک سیاہ بدلیاں پھٹ پڑیں...... آسمان کا منہ کھل گیا......

سوزی کھلی کھڑکی سے چپک کر بہت دیر تک بارش میں دھلتی رہی۔

سوزی پلٹی تو عذرا غائب تھی...... دفتر تقریباً خالی ہو چکا تھا۔

"باس اسے گرم گرم کافی پلا کر اپنی لیموسین میں گھر ڈراپ کر آئیگا۔

لجاتی شرماتی شام منہ میں ڈوپٹہ نچوڑتی آہستہ آہستہ اترنے لگی۔

سوزی لفٹ سے نکل کر گیٹ پر آئی...... دنیا بدل چکی تھی۔

گاڑیاں آنکھیں پھاڑے، گھٹنوں گھٹنوں پانی میں ٹٹول ٹٹول کر چل رہی تھیں...... مرد عورتیں بچے چھوٹی چھوٹی ڈھیروں کی صورت جگہ جگہ کھڑے سواری کے منتظر تھے۔

سوزی آنکھوں کے چبھتے جنگل میں اتر پڑی۔

اچانک اس کے اندر ایک بلبلہ پھٹا......

اسوقت کہیں سے شراف آجائے...... تو...... اس نے سر کو جھٹکا دے کر شراف کو

جھٹک دیا۔

اچانک اس کی آنکھیں حیرت اور بے یقینی کے سمندر میں لڑکھڑانے لگیں......

شراف موجود تھا......اس کی گاڑی فٹ پاتھ سے لگی کھڑی تھی۔

وہ سوزی کو دیکھ کر تیزی سے لپکا۔

"میری جان...... شراف کو آواز دینے کی ضرورت نہیں۔"

"اجازت دو تو تمہیں گود میں اٹھا کر گاڑی تک لے چلوں؟"......اس نے پھرتی سے اپنا لمبا بازو سوزی کی کمر میں ڈال دیا۔

سوزی نے اس کا ہاتھ الگ کر دیا۔

شراف نے گاڑی کا اگلہ دروازہ کھولا اور سوزی چپ چاپ پنجرے میں بند ہو گئی۔

کچھ لوگ ابھی تک گیٹ کے آس پاس منتظر کھڑے تھے......باقی شلواریں پتلونیں چڑھائے چھپ چھپ کرتے چل پڑے تھے۔

گاڑی یوں کھٹ سے اسٹارٹ ہوئی جیسے پانی کی بجائے ریگستان میں کھڑی تھی۔

شراف نے اچانک گیلی گیلی پھونک سے سوزی کے ماتھے پر جھکی لٹ کر تڑپا دیا۔

سوزی بگڑ گئی۔

"تیرے تین بچے ہیں......ایک بیوی ہے......اور شہر بھر میں لڑکی لڑکی جھک مارتا پھرتا ہے۔"

شراف پوری بے حیائی سے ہنسا۔

"شکریہ سوزی...... تھینک یو فار دی کامپلی منٹ' یو آر اے گریٹ گرل......"

سوزی کو دھچکا لگا...... یہ شخص گالی پر اترا رہا ہے...... کس قدر بے حیا ہے

شراف کی نظریں سوزی سے ہٹ کر سڑک پر جم گئیں......وہ اچانک اپنی عمر سے تین گنا بڑا لگنے لگا۔

"تم کہہ سکتی ہو کہ کل ہم دونوں شور SURE زندہ ہونگے؟ کون جانے تم نہ ہو' میں نہ ہوں......اس طرح روز زندگیاں کھیلتے کودتے ویسٹ ہو جاتی ہیں"

اس کی مسکراہٹ لوٹ آئی۔

"پھر کسی کو پڑوسی محبت سے دعوت پر بلائے تو وہ انکار کردے کیونکہ اس کے گھر کھانا موجود ہے...... سارے ہوٹل بند کروادو گی؟"

وہ واپس لوٹ آیا تھا...... اس کی شریر مسکراہٹ مونچھوں میں رینگنے لگی تھی۔

سوزی کو غصہ آنا چاہئے تھا...... نہیں آیا...... اچانک اسے ممی یاد آنے لگی...... اسے پچھتاوا ہونے لگا...... اس نے صبح صبح ممی کو کیوں اتنی بری طرح سے ڈانٹ دیا تھا...... بیچاری پور ممی۔

شراف اس کو خاموش دیکھ کر مزید پھیل گیا۔

"گلوباکس میں ولایتی وسکی کی فل (Full) بوتل رکھی ہے...... اور باہر دیکھو...... ان روشنیوں میں گیلی شام کتنی خوبصورتی سے اتر رہی ہے...... آؤ اس کو لوٹ لیں."

سوزی پگھلنے لگی...... اسکے من کا چور اسے پچھاڑ رہا تھا۔

"گھر میں ممی ہوگی"

"تمہاری ممی کو تم سے کہیں زیادہ موسموں کی قدر ہے.

شراف بڑے اطمینان سے گاڑی کمپونڈ کے اندر لے آیا۔

ممی گھر پر ہی تھی...... سوزی نے شراف کا جھوٹا سچا تعارف کرایا۔

ممی کا بجھا ہوا چہرہ جل اٹھا......

سنہری سیال گلاسوں میں اترا...... پھر ہونٹوں کو سہلاتا ہوا ذہن پر چھانے لگا۔

ممی پیاسی مچھلی کے ہانپتے گلپھڑوں سے پی رہی تھی...... شراف کھل کر اس کا ساتھ دے رہا تھا۔

سوزی چندھی آنکھوں سے انہیں دیکھتی اور چسکی لے لیتی۔

سوزی کے اندر پھر کھٹ پٹ سی ہونے لگی...... وہ چپکے سے اٹھی اور کونے میں رکھے صوفے کے ہتھے پر سر ڈال کر آنکھیں موند لیں......

اچانک اسے کمرے میں عجیب مردہ سناٹے کا احساس ہوا............ خود بخود اسکی

آنکھیں کھل گئیں۔

ڈائننگ ٹیبل خالی تھی...... شراب کی بوتل خالی تھی...... ممی کے کمرے میں تیز تیز سانسوں کی خوشبو پھیلی تھی۔

سوزی نے اپنے منہ سے اچھلتے ہوئے قہقہے کو سنبھال لیا..........

اسکے اندر کئی دنوں سے مسلسل ہونے والی کھٹ پٹ کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔

بھورا' زرد اور کالا

بھورا اپنے جسم کو توڑ تا مروڑ تا جمائیاں لیتا غار کے دہانے پر نمودار ہوا۔
خنک گیلی ہوا میں گھلی سنہری دھوپ اس کے برہنہ جسم کو سہلانے لگی۔
اس نے ایک لمبی ڈکار چھوڑی اور مطمئن خمار سے بوجھل آنکھیں کھلی چھوڑ دیں۔
دور دور تک 'ہر طرف جانے پہچانے درختوں' منہ زور جھاڑیوں اور کنواری تھرکتی گھاس کی حکومت تھی۔
بھورے کو اچانک جھٹکا لگا اور اسکا جسم سر سے پیر تک تن گیا...... اس کی مادہ جو ابھی چند لمحے پہلے باہر نکلی تھی...... کہیں نظر نہ آ رہی تھی۔
بھورے نے آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر سارا جنگل چھان مارا۔
پھر اس کی بھٹکتی نگاہیں ایک بھر بھری چٹان کے دامن میں اٹک گئیں...... روشنی اور سائے اتھل پتھل ہو رہے تھے اور لمبی گھاس بری طرح تلملا رہی تھی۔
بھورے کے سنہری بالوں کے جنگل میں دفن ہونٹوں سے چنگاریاں پھوٹنے

لگیں......اور وہ وحشتناک بے ڈھنگی چیخوں کے ساتھ دھما دھم اپنا چکنا سفید سینہ کوٹنے لگا۔

ارد گرد کے درختوں سے ایک ساتھ پرندوں کے بہت سارے جھنڈ چھپاک سے اڑے اور کچھ دیر فضا میں معلق پھڑ پھڑانے کے بعد تیز تیز 'سہمے پروں منتشر ہو گئے۔

بھورا بجلی کی رفتار سے اچھلتا' کودتا' پھلانگتا بھاگا...... اس کی رگوں میں عجیب و غریب کڑوا لاوا ابل رہا تھا۔

اب وہ نر اس کی مادہ کو سینے سے چمٹائے شیر خوار بچے کی طرح غوں غوں کر رہا تھا......اور مادہ اس کے اندر جذب ہوئے جا رہی تھی۔

بھورے کی آنکھیں حیرت اور غصے سے سلگ رہی تھیں۔

اس نے اپنے سوا کوئی اور نر پہلی بار دیکھا تھا......اس نر کا جسم جلی ہوئی لکڑی کی طرح سیاہ تھا......اور اس کے سر کے گندھے بالوں نے اس کا ماتھا اور آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔

بھورے نے کئی قدم پیچھے ہٹ کر اسے پوری قوت سے دھکا دیا......سیاہ نر وہیں چٹان کی طرح کھڑا رہا...... بھورا زمین پر گر گیا۔

سیاہ نر نے اپنے اندر گھسی مادہ کو ایک طرف پھینکا...... پھر لپک کر بھورے کو اس کے سنہری بالوں سے گھسیٹ کر اوپر اٹھایا اور اس کے منہ پر ایک خوفناک ٹکر ماری۔

اس نے مڑ کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی...... ایک طرف جھاڑیوں میں الجھی مادہ کو اٹھایا اور پھر سے اپنے ساتھ چپکا لیا۔

بھورا گیلی گھاس پر بے سدھ پڑا تھا......اس کا سر اور چہرہ بری طرح بلبلا رہا تھا۔

اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔

سیاہ مرد کم عمر تھا اور جسامت میں اس سے تقریباً دو گنا......

بھورے نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن لڑ کھڑا کر رہ گیا۔

سیاہ نر اور مادہ جا چکے تھے...... بھربھری چٹان کے دامن میں لیٹی گھاس سیدھا ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

اچانک بھورے کو پیچھے گردن پر گرم سانسوں کی نمی محسوس ہوئی...... خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں...... اس نے تڑپ کر بچاؤ کی کوشش کی...... پھر مڑ کر دیکھا۔

دائروں میں گھومتا ایک اور چہرہ اسے گھور رہا تھا۔

اس کا رنگ پھیکا زرد تھا اور اس کی آنکھیں کانوں کی لوؤں تک کھچی تھیں۔

بھورا پورا منہ کھول کر غرایا...... تکلیف سے اس کی چیخیں نکل گئیں۔

زرد چہرہ اچھلا اور کودتا پھلانگتا سرپٹ دوڑنے لگا۔

بھورے نے منہ پر ہاتھ پھیرا...... ہاتھ گاڑھے خون میں لتھڑ گیا...... اس نے بڑی احتیاط سے ہونٹوں اور ناک پر جمتے خون کو صاف کیا......

اس کی نگاہیں ایک بار پھر بھر بھری چٹان کی طرف اٹھ گئیں...... وہاں اب دو جنگی بلے آپس میں لڑ رہے تھے۔

بھورے نے لمبی لمبی سانسیں لیں...... پھر سنبھلتا ہوا بڑی مشکل سے کھڑا ہوا...... اور آہستہ آہستہ اپنی غار کی طرف چل پڑا۔

اس کے سر میں دھماکے ہو رہے تھے...... وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر رک گیا۔

دور جھاڑیوں کی چھدری شاخوں کی اوٹ میں اسے وہ دونوں پھر نظر آگئے...... وہ اپنے اردگرد کی دنیا سے بے نیاز آپس میں ٹھٹھیلیاں کرتے کبھی رک جاتے، کبھی چل پڑتے۔

بھورے کے اندر دوڑتا خون پھر آگ بن گیا...... لیکن اسکے تجربے نے اسے روک دیا۔

اس نے راستہ بدل لیا اور درختوں کی اوٹ میں چھپتا چھپاتا انکے پیچھے ہو لیا۔

وہ دونوں آپس میں گندھی جھاڑیوں کے پاس ٹھہر گئے۔

سیاہ نر نے جھک کر ایک بھاری پتھر اٹھایا اور ایک طرف لڑھکا دیا۔

نر نے مادہ کو اشارہ کیا...... وہ زمین پر بیٹھ گئی اور گھسٹ کر غائب ہو گئی......

سیاہ نر نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں...... پھر پتھر کو کھینچ کر قریب کیا...... اپنے مضبوط جسم کو سمیٹا اور آہستہ آہستہ بھورے کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

پھر دو لمبے پھڑکتے بازو باہر نکلے اور پتھر گھسیٹ کر واپس غار کے دہانے پر جم گیا۔

بھورا درخت کی اوٹ سے نکلا اور دبے پاؤں چلتا غار کے دہانے پر پہنچ گیا۔

وہ پتھر کو گھورتا رہا اور اپنے دماغ میں مچلتی کھلبلی کو سمجھنے کی کوشش میں چکرا گیا۔

اس نے پتھر کو ہلانے کی کوشش کی...... اپنے پھوڑا جسم کی ساری طاقت لگا دی۔

بھورا ناکام رہا۔

اس نے حقارت سے اپنے ہاتھوں پر خون آلود تھوک کی ڈھیری لگا دی۔

وہ پلٹا...... اسے جھاڑیوں میں حرکت کا احساس ہوا۔

زرد نر اپنی کھینچی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

بھورے نے اسے اشارے سے بلایا...... اور خود بھی اس کی طرف بڑھا۔

زرد نر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا...... پھر اچانک چوکڑی بھری اور ہریالی کے گھنے سمندر میں غائب ہو گیا۔

بھورا اپنے غار کے باہر کراہ رہا تھا...... اسکا چہرہ بری طرح سوجھ گیا تھا۔

اس کا ذہن ابل رہا تھا...... آج کے واقعات نے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا...... اس کی زندگی میں اتنا کچھ ایک ساتھ پہلی بار ہوا تھا۔

دھیرے دھیرے شام اترنے لگی...... ہریالی کے مختلف رنگ سرمئی چادر اوڑھ کر ایک ہونے لگے۔

پرندے تیز تیز پر چلاتے گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے اور جنگلی جانور شکار کی تلاش میں کچھاروں سے نکل پڑے تھے۔

جنگل کی آوازوں میں تبدیلی آگئی تھی...... ہر طرف خوف دانت نکوس کر پھیلنے لگا تھا۔

بھورے کی جبلت کے مطابق اس وقت غار کے اندر ہونا چاہیے تھا...... لیکن وہ کھلے میں پڑا اپنے ٹن ٹن بجتے دماغ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسے ایک نئی پریشانی مسلسل کتر رہی تھی۔

زرد نر بار بار جھلک دکھا کر غائب ہو جاتا تھا...... اسے احساس تھا کہ وہ کہیں آس پاس بالکل قریب چھپا اسے دیکھ رہا ہے اور...... جنگل میں نظروں سے اوجھل ہر چیز خطرناک ہوتی ہے۔

اس نے اپنی دکھتی آنکھیں پوری کھول کر چاروں اطراف گہری ہوتی تاریکی کو بار بار ٹٹولا...... زرد نر چھلاوہ تھا...... وہ تھا لیکن کہیں نہ تھا۔

اب خوف بھورے کی رگوں میں دوڑنے لگا...... اچانک قریب ہی کہیں جنگل کے بادشاہ کی دھاڑ گونجی...... بھورا تیزی سے غار کے دھانے کی طرف لپکا...... پھر رک گیا۔

اچانک اسکا پیٹ بری طرح سے بلبلانے لگا تھا...... اس نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔

بالکل اس کے سامنے لمبی جھولتی گھاس پھٹی اور اس میں ایک سر ابھرا۔

زرد نر وہیں رکا کچھ دیر بھورے کا جائزہ لیتا رہا...... پھر چوکنے قدموں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا...... اس کے دونوں ہاتھوں میں جنگلی سیب تھے۔

بھورے نے ندیدے پن سے ایک سیب اچک لیا اور اس پر منہ مارا..... تکلیف سے اس کی چیخ نکل گئی۔

زرد نر بدکا...... پھر سنبھل گیا۔

اس نے اپنے لمبے زرد دانتوں سے ایک اور سیب چھیلا اور بھورے کی طرف بڑھا دیا۔

بھورا سنبھل سنبھل کر دھیرے دھیرے سیب چوسنے لگا۔

جب آخری سیب ختم ہو گیا تو زرد نر اٹھا اور اچھل اچھل کر بے ہنگم آوازیں نکالنے لگا...... وہ ساتھ میں ہاتھ چلا چلا کر دور سیاہ پہاڑیوں کی طرف اشارے کرتا جاتا تھا۔

بھورے نے رخ پلٹا۔

پہاڑیوں کی دوسری طرف اندھیرے سے زیادہ گہرہ دھواں ابل رہا تھا...... دھوئیں کی جڑوں میں گاہے گاہے شعلوں کی چمک بھی دکھائی دے جاتی تھی۔

زرد نر نے سہارا دیکر بھورے کو اٹھایا...... پھر ہاتھ پکڑ کر پہاڑیوں کی طرف چلنے

لگا۔

پہاڑیوں کے دامن میں اژدھا کی مانند بل کھاتی آگ کی لمبی لکیر آہستہ آہستہ آگے بڑھتی چلی آرہی تھی۔

دونوں اونچائی پر لیٹ گئے اور اپنے ٹھنڈے جسم تاپنے لگے۔

بھورے کے پیٹ میں ایندھن پہنچ گیا تھا...... اس پر غنودگی طاری ہونے لگی...... اور زندہ مادہ ایک ہیولے میں بدلی اور پھر ذہن سے یکسر اتر گئی۔

زرد نر بے فکر خراٹے لے رہا تھا۔

اچانک بھورے کے ذہن میں گرم سرد لہروں کا ایک زلزلہ سا آگیا...... وہ اچھلا اور زرد نر کو بری طرح سے جھنجھوڑ ڈالا...... پھر وہ اپنی ساری اذیت بھول کر والہانہ ناچنے لگا۔

زرد نر کچی نیند میں اسے گھورے جارہا تھا۔

بھورے نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے کھینچتا ہوا پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔

جوان آگ اب دیوانی ہورہی تھی۔

بھورے نے سرپٹ دوڑتی آگ کے منہ میں سے خشک گھاس کا کلاوہ بھرا اور اسے جڑ سے اکھیڑ لیا۔ پھر وہ دیوانہ وار گھاس اکھیڑ اکھیڑ کر آگ کے الٹے رخ ڈھیر کرنے لگا۔

زرد نر اسے الجھا الجھا دیکھتا رہا...... پھر بھورے کا ساتھ دینے لگا۔

سیاہ نر کی غار کے منہ پر سوکھی گھاس کا ایک اونچا ڈھیر لگا تھا...... بھورا ہاتھ میں پکڑی سلگتی لکڑی کو پھونک پھونک کر زندگی دے رہا تھا۔

اس نے زرد نر کو اشارہ کیا...... دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے کو، پھر غار کے منہ میں پھنسے بھاری پتھر کو گھورتے رہے۔

لرزتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ انہوں نے گھسیٹ کر پتھر کو غار کے منہ سے ہٹایا اور دوڑ کر گھنی جھاڑیوں کے پیچھے جا چھپے۔

غار میں خاموشی تھی...... سیاہ نر گہری نیند سو رہا تھا۔

وہ دبے پاؤں باہر نکلے اور جلدی جلدی غار میں سوکھی گھاس بھرنے لگے۔

جب ساری گھاس اندر منتقل ہو گئی تو اس میں سلگتی لکڑی ڈال کر سہمی سہمی پھونکوں سے آگ جلائی گئی۔

گھاس چیخ چیخ کر جلنے لگی...... دونوں نے لپک کر پتھر واپس غار کے منہ میں پھنسایا اور اپنے پورے وزن کے ساتھ اس کے اوپر جم کر بیٹھ گئے۔

انہیں محسوس ہوا کہ پتھر پر اندر سے دباؤ پڑ رہا ہے۔

دونوں خوف سے لرزنے لگے......

انہوں نے ماتھے سے ماتھا جوڑا اور اپنی پوری قوت پتھر پر لگا دی۔

خنکی کے باوجود انکی کن پٹیوں سے ٹپ ٹپ پسینہ گر رہا تھا۔

پھر ایک طویل وہشناک وقفے کے بعد دباؤ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا...... وہ پتھر کو دبائے اسی طرح جمے رہے۔ پتھر تپ کر آگ ہو رہا تھا...... انکے ہاتھ بری طرح سے جھلس گئے تھے۔

بھورے نے زردنر کی آنکھوں میں جھانکا...... وہ خوف سے پتھر بن گئی تھیں۔

بھورے نے فاتحانہ قہقہہ لگایا اور پتھر سے ہاتھ کھینچ لیئے۔

پھر دونوں نڈھال وہیں لیٹ گئے۔

صبح ہوئی تو درختوں کی چوٹیوں پر نرم دھوپ کی بجائے گرہن کی پھپوندی بکھری تھی...... پرندے دم مارے دبکے پڑے تھے اور درندے خوف کے مارے کچھاروں میں جا چھپے تھے۔

بھورے نے ایک نظر پتھر پر ڈالی...... پتھر ویسے ہی رکھا تھا...... غار کا منہ بند تھا۔

اس نے زردنر کی پیٹھ پر زوردار ٹھوکر لگائی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور حیران پھٹی آنکھوں سے بدلے ہوئے بھورے کو گھورنے لگا...... اس کی کھچی آنکھیں اور کھچ گئی تھیں۔

بھورے نے زردنر کی مدد سے ٹھنڈے پتھر کو ہٹایا...... اندر سے کڑوے 'بدبودار دھوئیں کا ایک ریلہ آیا اور دونوں کھانستے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ غار دھوئیں کے بادل اگل رہا تھا...... بھورا خوشی سے اپنا سفید چکنا سینہ پیٹ رہا تھا۔ زردنر ہاتھوں میں سر دبائے ایک طرف

بیٹھا تھا......اس کے ماتھے پر پریشانی کی لاتعداد سلوٹیں تڑپ رہی تھیں۔

علاج

عاشاں سردیوں کی بے فیض دھوپ میں اکڑوں بیٹھی ساگ بنا رہی تھی۔
دھن دھنا دھن...... اچانک باہر دروازے پر پاگل بھوت ناچنے لگے......
'سراج نے دروازہ لگوا کر مصیبت لگوا لی ہے...... دن میں بیس بار کھولنے' بند کرنے
اٹھو'
اس نے درانتی ایک طرف ڈالی اور گٹھیائے گھٹنوں کی آہوں کے ساتھ اٹھ کھڑی
ہوئی۔
دروازہ بری طرح بلبلا رہا تھا۔
'لوٹنے والوں کو کھلے بند دروازوں سے کیا...... جدھر سے چاہیں آ سکتے ہیں۔'
ابھی مشکل سے آدھا کنڈا سر کا تھا کہ دروازہ کے جبڑے دھماکے سے کھلے اور
بھولے کو اگل دیا...... بھولا زخمی خرگوش کی طرح سمٹتا' پھسلتا آنگن پھلانگ کر چشم زدن میں
اکلوتی کوٹھڑی کی کوکھ میں غائب ہو گیا۔

عاشاں وہیں کھڑی کھڑی لمبے لمبے ہاتھ ملنے لگی۔

'خصماں کھانے نے پھر دیکھ لیا ہوگا کوئی بھوت......اس کا کیا بنے گا!'

وہ واپس آنگن میں آئی اور درانتی اٹھالی۔

'مر ہی جائے تو اچھا ہے......ایک ساتھ صبر کرلیں گے۔'

عاشاں کی دھندلی آنکھیں کوٹھڑی کی تاریکی ٹٹولتی رہیں......پھر دو پڑولوں کے بیچ جھری پر ٹھہر گئیں......

بھولے کی خوف سے رندھی ایک آنکھ بے بس التجا بنی پھیلی تھی۔

عاشاں کی ماںمتا کے گرد قہر کا حصار چھناکے سے ٹوٹ کر پگھل گیا......اور زخمی ماںمتا سیلاب کی صورت بہنے لگی۔

آجا...... نکل آباہر" درانتی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی تھی۔

"نہیں......" بھولا ممنایا۔

انہوں نے گاؤں میں ڈیرہ ڈال لیا ہے......میں نے خود اپنی آنکھوں سے......

عاشاں نے اسے پھسلانا چاہا......

"میں تمہیں خود چھوڑ آتی ہوں......وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے......وہ تو ڈاکوؤں اور قاتلوں کو پکڑتے ہیں۔ دیکھ...... تیرا باپ انتظار کر رہا ہوگا۔"

اس نے ہاتھ لمبا پھیلایا......ہاتھ فضا میں معلق لرزتا رہا۔

عاشاں نے سر پیٹ لیا۔

"رباب مجھے اٹھالے......جوان جہان اولاد اور......"

باہر دروازہ ایک بار پھر ہنہنایا...... سراج اپنی بھدی لاٹھی کے سہارے ہانپتا' پھنکارتا چلا آرہا تھا۔

"کدھر ہے؟ آج میں اسے ختم کردونگا۔"

لاٹھی پڑولے کی گردن پر پڑی اور پڑولے کی گردن بغیر کسی آواز کے ٹوٹ کر ایک طرف لٹک گئی۔

عاشاں پھدک کر بیچ میں آگئی۔

”بھولے کے ابا...... میں ہاتھ جوڑتی ہوں...... رک جا۔“

سراج کی گدلی آنکھوں میں حیرانی اُڈ آئی۔

”تم...... تمہیں آج کیا ہو گیا ہے؟ تم تو مجھ سے چار قدم آگے ہوتی تھیں۔“

عاشاں نے سراج کے ہاتھ سے لاٹھی لے لی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی۔

”بھولے کے ابا...... ہم اسے بچپن سے مارتے پیٹتے چلے آرہے ہیں...... کچھ بھی نہیں ہوا...... کوئی فرق پڑا ہے؟ مجھے تو لگتا ہے وہ اپنے بس میں نہیں رہتا۔“

سراج اپنے گرد لپٹتی رسی توڑ کر گرجا۔

”چوہدری کے ہل کا پھل...... بھٹی میں چھوڑ کر آیا ہوں۔“

عاشاں کا جبڑا پھیل گیا اس نے چوہدری کو چبا ڈالا

”پھل میں دیر ہو جائیگی تو چوہدری مر نہیں جائیگا۔“

سراج اپنا گنجا سر کھودتا واپس چارپائی پر بیٹھ گیا۔

عاشاں کے ذہن میں پھڑ پھڑاتی سوچ ہونٹوں تک آگئی۔

”کیوں نا کسی سیانے......“

”کون سا سیانا رہ گیا ہے...... تعویز گنڈے، جھاڑ، پھونک......“

بھولا گیلے چوہے بدن میں سمٹتا باہر آ گیا۔

”ابا...... وہ گاؤں میں رہا کریں گے...... جائیں گے نہیں...... بہت سارے......“

وہ باپ کے قدموں سے لپٹ کر بلکنے لگا۔

سراج اٹھ کھڑا ہوا...... اسکی آنکھوں میں گدلی الجھنوں کا گہرا غبار تھا۔

بھولا سارا دن گھر میں دبکا بیٹھا رہا...... اور اپنے آپ کو کوستا رہا۔

شام کو سراج لوٹا تو اس کی آنکھیں نسبتاً صاف تھیں۔

عاشاں نے باپ بیٹے کو گھی میں گندھی مکی کی روٹیوں کے ساتھ تھالیاں بھر بھر کر ساگ دیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر سراج نے صدری کی جیب سے تڑی مڑی سگریٹ نکالی اور اس کے بل سیدھے کرنے لگا۔ بھولا خاموشی کی گھٹن سے گھبرا کر باہر آنگن میں آگیا۔

سراج نے سگریٹ کو تیلی لگائی...... پھر عاشاں پر آنکھیں جمادیں۔

"رفیق جولاہے کا خیال ہے بھولے کو شہر بھیج دیا جائے...... ہوا بدلی ہو گی تو ٹھیک ہو جائیگا"

عاشاں کا دل برف کا گالا بن گیا۔

"رہے گا کہاں؟ کھانا کون پکا کر دے گا؟ کپڑے......"

سراج نے اسے سہارا دیا۔

"رفیق جولاہے کا داماد شہر میں رہتا ہے...... اچھا آدمی ہے...... اور پھر بھولا اب بچہ نہیں......"

عاشاں اندر ہی اندر رو دی۔

"ایک ہی تو ہے...... وہ بھی آنکھوں سے دور...... اجنبی شہر میں......"

سراج نے چھٹی کی اور خود بھولے کو بڑی سڑک تک لے گیا...... وہ سارا راستہ اسے نصیحتوں میں باندھتا رہا۔ بس میں بٹھا کر اس نے بھولے کو کچھ روپے اور رفیق جولاہے کی پرچی دی اور تاکید کی کہ دونوں چیزیں سنبھال کر رکھنا۔

بھولے کا دل ڈوب رہا تھا......

بس کی کھڑکی میں سے بھولے نے باہر کا جائزہ لیا...... اس کا باپ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اچانک اس کے باپ کے کپڑوں کی رنگت بدل گئی۔

بھولے نے بڑی مشکل سے چیخ روکی اور جلدی سے منہ پھیر کر سیٹ میں دھنس گیا۔

وہ بے حد پریشان تھا...... اس کا باپ بھی بھوت بن گیا ہے!

جہاں بس رکتی...... بھولا جلدی سے باہر آنکھیں دوڑاتا...... میدان صاف ہوتا تو

خوب پھیل کر نئی زندگی کو چوستا اور اگر کہیں بھوت نظر آتا تو فوراً آنکھیں بند کر کے جل تو جلال تو کا ورد کرنے لگتا۔

بھولے کو کئی بار بے بے کا خیال آیا۔

"چلو باپ تو ہمیشہ باپ ہوتا ہے...... بے بے کو کیا ہو گیا تھا...... کس بیدردی سے اٹھا کر پھینک دیا ہے ظالم دنیا میں......"

بس کافی دیر تک جانوروں، انسانوں گاڑیوں اور بے پناہ شور کے جنگل میں پھنکارتی آخر کار ایک جگہ رک گئی...... شہر آ گیا تھا۔

بھولے نے سیٹ کے نیچے سے پوٹلی کھینچی اور کسمساتی، بے چین قطار کے ساتھ پھسلتا ہوا بس سے باہر آ گیا۔

اس نے باریک بینی سے آس پاس کا جائزہ لیا...... میدان صاف تھا...... کہیں کوئی بھوت نہ تھا...... اسے شہر اچھا لگا۔

اس نے جیب سے پرچی نکالی اور ایک پتلون والے کو تاک کر اسکے سامنے کر دی۔

پتلون والا کچھ دیر کچے حروف جوڑنے میں لگا رہا...... پھر جان چھڑائی۔

"وہ سامنے بڑے بورڈ کے نیچے چائے کا ہوٹل ہے...... ریلوے کالونی اسکے پچھواڑے ہے...... باقی ہوٹل والے سے پوچھ لینا۔"

بھولا پھٹی، متجس آنکھوں سے نئی دنیا کو ٹٹولتا، پرکھتا چل پڑا۔

'عجیب مخلوق ہے...... بند آنکھیں دوڑے چلی جا رہی ہے...... ان کے پیچھے لگے کتے کہیں نظر نہیں آتے۔'

اس کے اندر ٹھٹھری مسکراہٹ منہ میں انگلی دبائے باہر آ گئی۔

ہوٹل کا مالک فارغ تھا...... وہ کرسی میں دھنسا اپنی خونخوار مونچھوں سے موچنے آئینے کا کھیل کھیل رہا تھا۔ بھولے نے پرچی کھولی اور قدم بڑھایا۔

اچانک ایک لمبی، بھاری بھر کم گاڑی چیخ مار کر بالکل اسکے سامنے رک گئی اور دھم

دھم گاڑی کے پیٹ سے ایک کے بعد ایک بھوتوں کو پوری فوج کودنے لگی۔

بھولا تڑپا اور بندوق کی زد پر آئے ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتا بھاگ اٹھا۔

وہ ٹھوکریں کھاتا' مارتا سرپٹ بھاگا چلا جا رہا تھا...... خوف اور ہوا گلے لگ کر اس کے کانوں میں اودھم مچا رہے تھے...... اس کے پھیپھڑوں سے دھواں اٹھنے لگا...... وہ رکا نہیں' دوڑتا رہا۔

اچانک ایک ساتھ بہت سارے سخت' کھردرے ہاتھوں نے اسے جکڑ کر بے بس کر دیا...... اس کی پیٹھ' سر' پیٹ' سینہ...... جسم کے ہر عضو سے غیر فطری فعل ہونے لگا۔

بھولا ہوش میں آیا تو اس کا جسم ٹھنڈے پانی میں بھیگا چوہا بنا تھا...... اس کے چاروں طرف بھوت ہی بھوت ہے...... ان کے تیز نوکیلے سینگ بڑے خوفناک تھے۔

ایک بھوت لمبے لمبے ڈگ بھرتا' پانی چھلکاتی بالٹی اٹھائے اسکی طرف آ رہا تھا۔

بھولے نے ٹھنڈے پانی کی مار سے بچنے کے لئے اٹھنے کی کوشش کی تو پیچھے سے ایک فولادی لات نے اسے پھر گرا دیا۔

بھولے کے کانوں میں وقفے وقفے سے اجنبی سوالوں کی دھمک ہو رہی تھی۔

"اسلحہ کہاں چھپا رکھا ہے؟ ساتھیوں کے نام بتاؤ۔ کہاں کہاں ڈاکے ڈال چکے ہو؟"

بھولا بار بار اذیت کے سمندر سے ابھر کر کراہ اٹھتا۔

"میں بھولا ہوں...... کسو کی کے لوہار کا بیٹا ہوں...... اس نے مجھے شہر میں علاج کے لئے بھیجا ہے......"

بھولے نے اپنا جسم فٹ پاتھ پر بکھرا پڑا پایا...... اس کے آس پاس اندھی بھیڑ بھاگی چلی جا رہی تھی۔

گرم سورج نے اس کا جسم خشک کر دیا تھا...... اس کی چوٹیں آہستہ آہستہ دم سادھنے لگیں...... اس نے اپنے آپ کو سمیٹنے کی کوشش کی تو اس کی بوٹی بوٹی سرعام رو دی۔

اس نے اپنی جیب ٹٹولی...... جیب ہی غائب تھی۔

اس کے اندر ایک خوفزدہ چیخ سکنے لگی۔

"اب کیا ہوگا؟"

اس نے کروٹ بدلی...... چھن چھن...... کچھ ریزگاری فٹ پاتھ پر ج اٹھی......

اس نے حیرانی سے دیکھا...... ریزگاری کے ساتھ اکادکا چھوٹے نوٹ بھی تھے۔

اس کے سارے دکھ سو گئے...... وہ ریزگاری اور نوٹوں پر ٹوٹ پڑا۔

پھر بھولا لڑکھڑاتا، لنگڑاتا واپس بس اسٹاپ پر پہنچ گیا۔

اس نے سرکاری نل سے منہ ہاتھ دھویا...... پھر اپنے غلیظ، پھٹے ہوئے کپڑوں کو حقارت سے دیکھا۔

"اگر پوٹلی ہوتی تو کپڑے بدل لیتا...... اس حلیئے میں گاؤں والے دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے!"

اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔

"گاؤں پہنچتے پہنچتے رات ہو جائیگی...... اندھیرے میں......"

اس نے ٹکٹ خریدا اور بس کی طرف آ گیا۔

بس کے دروازے سے لگے دو بھوت تنے کھڑے تھے...... بھولے نے انہیں ایک نظر دیکھا...... منہ میں بہت سا تھوک جمع کر کے پوری قوت سے زمین پر تھوک دیا...... اور شانے اچکاتا بس میں جا بیٹھا۔

جنت

ایک گرجدار لپلپاتی گڑگڑاہٹ کائنات کے ذرے ذرے میں اتر گئی۔
غفورے کی ہڈیوں نے گوشت چھوڑ دیا' وہ جھول کر گر گیا' گرا رہا۔
صدیاں گزریں یا ایک لمحے میں ہزاروں صدیاں سمٹ گئیں' وقت کا دریا بہتا رہا یا ٹھہر گیا۔

پھر اچانک اس کے حواس پر تنے سیاہ کفن پر نیم روشن گولے کھیلنے لگے' کچھ دیر کھیلتے رہے' پھر آہستہ آہستہ سارے گولے ایک ایک دو دو کر کے غائب ہو گئے۔ غفورے کو ہوش آ گیا تھا۔

اس نے اپنے اردگرد دیکھ کر اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کی۔
اس کا محافظ فرشتہ سربجود تھا۔ اس کا سر سنہری چاندنی کے غبار میں دھنسا ہوا تھا۔
غفورا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ عادتاً اپنے کپڑے جھاڑے اور پھر ہنسنے لگا۔ اس کے جسم پر لباس جیسی کوئی چیز نہ تھی۔

"یہ کیا چکر ہے بھائی فرشتے؟"

فرشتہ سہم کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"غفورے میں تمہیں بیس بار سمجھا چکا ہوں کہ تم رب العزت کی بارگاہ میں پیش ہونے والے ہو۔ کچھ آداب تو سیکھ لو" غفور کو پھر فرشتے کی بات سمجھ نہ آئی۔

"فرشتے بھائی جب سے یہاں آیا ہوں تم بس ڈانٹتے ڈراتے رہتے ہو اور بار بار یہ دہشتناک آواز بھی پیدا کرتے رہتے ہو۔ میں پڑھا لکھا تو نہیں۔ دل میں کچھ زبان پر کچھ۔ سیدھا سادھا اللہ کا گنہگار غفورا ہوں۔ اچھا پہلے یہ بتا' یہ جو بڑی لفڑے دار آواز آئی تھی' یہ کس کی کارستانی ہے؟"

فرشتے نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے اور اتنی سختی سے کہ اس کے ہونٹوں سے لال لال خون موتی بن کر گرنے لگا۔ غفورا لپکا اور مٹھیاں بھر بھر کر جیب میں ڈالنے لگا۔ اس پر ہنسی کا ایک اور دورہ پڑا۔ اس کے کپڑے ہی نہیں تھے تو جیب کیسی!"

فرشتے کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"اتنے خوبصورت موتی بیکار ضائع ہو جائیں گے۔ منے کی اماں کو دو چار زیور بنوا دونگا۔ اسے زندگی میں کچھ نہیں دے سکا"

فرشتہ الجھ گیا۔ جب سے غفورا آیا تھا وہ الجھا ہوا تھا۔

"غفورے...... تم یہاں بھی چوری سے باز نہیں آئے!"

"چوری...... فرشتے بھائی چوری دیکھنی ہے تو ذرا نیچے کا چکر لگا کر دیکھو...... میں نے تو بس ایک بار چوری کی تھی۔ تمہاری بھابھی کے رکھے ہوئے کچھ پیسے چرائے تھے۔ تین دن تک ہر آنے جانے گزرنے والے پر شک کرتی رہی۔ میری طرف دھیان ہی نہ گیا۔ تیسرے دن میں نے پیسے چپکے سے واپس رکھ دیئے۔ بتا یہ چوری تو نہ ہوئی نا؟"

غفورے نے انجانے میں فرشتے کے کندھے پر ہاتھ رکھدیا۔ اس کا ہاتھ ٹھنڈ سے جل گیا۔ اس نے جلدی سے کھینچ لیا اور دوسرے ہاتھ سے رگڑ رگڑ کر گرم کرنے لگا۔

"تم تو برف کی سل ہو۔ پہلے مل جاتے تو زندگی کچھ ٹھنڈی ہو جاتی۔"

فرشتہ پریشان ہو گیا۔ اتنا پریشان کہ اس کے سر کے بال بھاپ بن کر ہوا میں تحلیل ہو گئے۔

آسمانوں پر زلزلہ آیا ہوا تھا۔ ایسا گنوار اور لاابالی مردہ آج تک نہ آیا تھا جو فرشتوں تک سے ہنسی ٹھٹھول کر جائے۔ خدائے لم یزل کو اطلاع کر دی گئی تھی۔ وہاں سے حکم آیا تھا کہ اسے ابھی فوری طور پر بارگاہ رب العزت میں نہ پیش کیا جائے۔ فرشتے سمجھ گئے کہ یہ گستاخ کہیں وہاں بھی گستاخی نہ کر بیٹھے۔

غفورے کے ساتھی فرشتے نے اس پر ہزاروں داؤ آزمائے۔ غفورا صدیوں کا بگڑا ہوا تھا اس پر کیا اثر ہوتا۔

کئی بار اس کے جی میں آیا کہ وہ خدائے لم یزل کی خدمت میں جا کر عرض کر دے کہ یہ مردہ اس کے بس کا نہیں ہے اسے کسی اور کے سپرد کر دے، لیکن غلامی اس کی سرشت میں داخل تھی۔

فرشتے نے اپنے نئے معصوم غموں سے بڑی مشکل سے سر باہر نکالا ایک عجیب وغریب منظر اس پر پڑا۔ غفورے کے ہاتھ میں ایک بڑا پتھر تھا اور وہ اس پتھر سے مار مار کر دوسرے پتھر توڑ رہا تھا۔ پسینے کے قطرہ اس کے ماتھے پر سجے تھے۔

"غفورے کیا کر رہے ہو؟"

غفورے نے فرشتے کو گھورا۔

"ہاتھ میں چل ہو رہی تھی۔ یہاں کام کرنے کا تو ہے نہیں، سوچا چلو پتھر ہی توڑتے ہیں۔ کچھ تو کرنا چاہئے بیکار دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے، لو یہ لو...... تم بھی مزے کرو۔"

فرشتے نے بغیر سوچے سمجھے پتھر لیا اور دوسرے پتھر پر دے مارا۔

فرشتہ لرزنے لگا۔ اس کے روئیں روئیں میں ایک عجیب وغریب، انجانی کیفیت سرایت کر گئی۔ پھر وہ بے خودی میں اپنے آپ کو، ہر شے کو بھول کر پتھر توڑنے لگا۔ تھوڑی سی دیر میں سنہری دھند میں ہر طرف زیادہ گہرے سنہرے رنگ کے پتھروں کے ڈھیر لگ

گئے۔

غفورا فرشتے کے بالکل قریب آگیا۔ اب اس کے حیران ہونے کی باری تھی۔

"بلے بلے بھائی...... ذرا سنبھل کر ہاتھ پاؤں نہ زخمی کر لینا۔"

فرشتہ سنبھل گیا اور عجیب بھی بھی نظروں سے ٹوٹے پتھروں کو دیکھنے لگا۔

غفورے نے بڑی گرم جوشی سے سوال کیا۔

"بتا مزہ آیا نا' یہ تو کچھ بھی نہیں' چل میری دوکان پر' میں برتن بناتا ہوں' آہ' محنت کا مزہ ہی اور ہے...... چل اب کچھ کھانے کا بندوبست کر' صبح سے بھوکے پیٹ گھوم رہے ہیں۔"

غفورے نے کہنے کو تو کھانے کا کہہ دیا' لیکن وہ سوچنے لگا اسے تو بالکل بھوک نہیں ہے۔

فرشتہ ایک بار پھر پریشان ہو گیا' اتنا پریشان کہ اس کا دماغ کھوپڑی سے نکل کر کافی دیر تک ہوا میں معلق رہا۔

ایک بار پھر وہی لیلپاتی گرجدار گڑگڑاہٹ کائنات کے ذرے ذرے کو جھنجھنا گئی۔

غفورے کی ہڈیوں نے گوشت چھوڑ دیا۔ وہ جھول کر گر گیا' گرا رہا۔

جانے کب اسے اپنے ہونے کا احساس ہوا۔ اس کے اردگرد ایک بالکل نیا حیران کن منظر تھا۔

فرش نور تھا' فضا موسیقی تھی اور ہوائیں خوشبو تھیں۔

غفورا اپنے آپ کو جھاڑتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس کے پاؤں کے بالکل ساتھ چمکتے سفید رنگ کی نہر بہہ رہی تھی۔ غفورا آؤ دیکھا نہ تاؤ' سیدھا نہر میں کود گیا...... تازہ' شیریں' نیم گرم دودھ اس کے لالچی معدے میں اترنے لگا' اترتا رہا...... فرشتے لپک کر آیا اور اسے نہر سے ہٹایا......

"یہ نہر ازل سے بہہ رہی ہے اور ابد تک بہتی رہے گا۔ یہ تمہارے لئے ہے"

غفورا کچھ شرمسار تھا...... وہ اپنے بھدے پاؤں دیکھ رہا تھا جن پر ابھی تک دودھ

کے قطرے کھڑے تھے۔ غفورے نے مشکوک نظروں سے فرشتے کو جانچا۔

"دیکھ میرے ساتھ ہمیشہ دھوکہ ہوا ہے۔ مجھے کس کا اعتبار نہیں رہا"

غفورا تذبذب کے عالم میں کھڑا تھا کہ فرشتہ بولا۔

"غفورے...... تم تو دودھ میں لگ گئے، پہلے ایک بڑی خوشخبری تو سن لو...... رب العزت کی عنایت سے تمہیں جنت میں جگہ مل گئی ہے"

غفورے کی آنکھیں پھٹ گئیں...... اس کے پیٹ میں گدگدی ہونے لگی۔

"مجھے...... غفورے کو...... جنت؟"

اب بات اس کے ذہن میں آ گئی تھی۔

"یہ دودھ کی نہریں...... پر میں تو بڑا گناہگار ہوں...... میں غفورا ہوں"

فرشتے نے اسے تھپکی دی۔

"وہ بڑا رحیم ہے...... چل اب آگے چل، ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے"

غفورا فرشتے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلنے لگا۔

اچانک اس کی نظر ایک آدھ کھائے سیب پر جا پڑی...... غفورا اس سیب کی طرف لپکا اور اسے اٹھا کر کھانے والا تھا کر فرشتہ بیچ میں آکھڑا ہوا۔

غفورے نے کھا جانے والی نظروں سے فرشتے کو گھورا۔

"دیکھتا نہیں کتنا لال لال سیب ہے۔ یہ آدھا کون کھا گیا ہے...... اور دیکھو تو باقی آدھا ضائع کر گیا"

فرشتہ پھر تذبذب کی دھول میں الجھنے لگا۔

"یہ سیب آدم اور حوا نے کھایا تھا"

غفورا اچھٹ پڑا۔

"توبہ توبہ...... نعوذباللہ۔ آدم کہتا ہے...... حوا کہتے ہو...... حضرت آدم علیہ سلام کہو، بی بی حوا کہو......" غفورے نے ابھی جملہ ختم نہ کیا تھا کہ اسے فضا میں برستی بوندوں جیسے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا...... حوروں کا ایک جم غفیر تھا جو اس کی

طرف بڑھا آرہا تھا۔

غفورے کو مر مرا کر ایک عدد میلی کچیلی بدبودار عورت نصیب ہوئی تھی...... اس کے جگر میں چھلنی سے بھی زیادہ سوراخ ہو گئے۔ اس نے ایک زوردار نعرہ لگایا اور دیوانہ وار حوروں کی جانب دوڑ پڑا۔ پھر سب سے پہلی حور کو کمر سے دبوچ کر بولا

حور جی...... میں غفورا ہوں...... مجھے جنت میں جگہ مل گئی ہے"

فرشتے نے اپنی ظالم انگلی اٹھائی' غفورے کا ہاتھ جل اٹھا۔ اس نے جلدی سے حور کو چھوڑ دیا اور اپنے ہاتھ ملنے لگا۔

"تم میرے بیوی سے ملے ہو......؟"

فرشتہ مسکرانے لگا۔ غفورے نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور منہ پھیرتے ہی اس کی آنکھیں ہر قسم کے پھلوں سے لدے درختوں پر پڑیں۔ غفورا چھلانگیں مارتا سب سے پہلے درخت پر جا چڑھا اور بے تحاشہ پھل توڑنے لگا۔

غفورے نے جنت میں اودھم مچا رکھا تھا۔ جنت کا ہر باسی حیران تھا کہ خدائے لم یزل نے اس عجیب و غریب گنوار کھلنڈرے مردے کو یہاں کیسے بھیج دیا ہے۔ اس نے جنت کی سنجیدگی کو تباہ کر دیا ہے۔ پھر وہ اپنی اس جسارت پر شرم سار ہوتے اور اسے اللہ تعالےٰ کی کوئی مصلحت جان کر دل کو تسلی دے لیتے۔

پھر کچھ عرصے بعد جنت کی فضا پر اداسی کا پرانا غلاف واپس آنے لگا۔

غفورے میں تبدیلی آنے لگی۔ اس کی شوخی کم ہونے لگی' پہلے وہ نچلا نہ بیٹھتا تھا' اب گھنٹوں گم سم بیٹھا اپنی انگلیاں چٹخاتا رہتا یا پھر اٹھ کر بے دلی سے پتھر توڑنے لگتا۔

فرشتے خوش تھے کہ ان کی محنت رنگ لائی ہے اور یہ گنوار مردہ بھی آخر کار راہ راست پر آ گیا ہے۔

پھر ایک دن فرشتے اور جنت کے دوسرے باسی حیران پریشان ہو گئے۔

غفورا اچانک بیٹھے بیٹھے دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس کی آہ و بکا سے جنت کے باسی تو ایک طرف دور رہنے والے دوزخ کے مردے بھی دیواروں پر چڑھ کر یہ عجیب و غریب منظر

دیکھنے لگے۔ جنت کی سنجیدہ فضا میں اس قسم کا شور و غل پہلی بار سنا گیا تھا۔

فرشتوں نے ہزار کوشش کی کہ غفورا چپ ہو جائے۔ پھلوں سے لدے درخت چلتے ہوئے آئے اور اس کے سامنے جھک گئے۔ دودھ کی نہریں اس کے قدموں کو بوسے دے کر گزریں کہ غفورا ایک نظر اٹھا کر انہیں دیکھ لے۔ حوریں دائرے کی صورت اس کے گرد جمع ہو گئیں اور اسے چمکارنے لگیں۔ غفورے کسی طرف توجہ نہ دی۔ وہ روتا رہا۔ اس نے سات آسمان سر پر اٹھا رکھے تھے۔

جب ہر کوئی بے بس ہو گیا اور غفورے کے نالوں سے جنت کے باسیوں کے کان پھٹنے لگے تو ایک کڑک دار گرجتی آواز ابھری۔ اس آواز کے پیچھے محبت اور شفقت کی ایک طویل لکیر تھی۔

غفورے کا سر پہلی بار جھک گیا۔ وہ فرشتوں اور جنت کے تمام باسیوں کی مانند سربسجود ہو گیا پھر اس کے گلے سے پھنس پھنس آواز نکلی۔

"رب العزت...... تو سب کا ہے...... غفورے کا بھی ہے۔ میری ایک عرض ہے۔ سن لے...... میرے بچے چھوٹے ہیں' پیچھے میری بیوی اکیلی ہے۔ کوئی اور کمانے والا نہیں ہے۔ میری کوئی جاگیر نہیں ہے' نہ ہی کوئی مل ہے' میرے بیوی بچوں کا برا حال ہو گیا ہو گا...... انہیں کوئی نہیں پوچھے گا...... مجھے واپس بھیج دے' وہ بڑے ہو جائیں گے تو میں خود آجاؤنگا۔"

ایک اور دھماکا ہوا...... سر سنہری چاندنی میں مزید دھنس گئے' درخت ٹیڑھے ہو گئے حوریں سہم گئیں' دودھ نہروں سے اچھل کر باہر گرنے لگا۔

پھر غفورے کو محسوس ہوا کہ کون و مکاں میں ایک دھیمی دھیمی پر شفقت مسکراہٹ سما گئی ہے' یہ مسکراہٹ اس کے اندر بھی اتر گئی تھی...... وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ اپنی جھلنگا چارپائی سے نیچے گر گیا تھا...... اس کے سر پر کھڑی اس کی میلی کچیلی بیوی اس کو کوسنے دے رہی تھی'

"سورج سر پر آگیا ہے...... تمہیں کیا۔ بھوکی مرونگی میں اور میرے بچے"

غفورے نے اسے ایک عرصے بعد غور سے دیکھا...... اس کی آنکھوں میں پیار تھا......اس کی بیوی ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

اس نے جلدی جلدی منہ پر چھینٹے مارے۔ دو چار نوالے الٹے سیدھے نگلے...... بیوی کے ہاتھ سے کھانے کی پوٹلی لی اور دروازے سے نکلنے والا تھا کہ ننگ دھڑنگ بچے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف بڑھے۔

اس نے سب کو گلے لگا کر پیار کیا پھر ایک نئی مسکراہٹ کا دامن تھامے کام پر چلدیا۔

مریض

میں نے پورے تین سال شاہی قلعے میں گزارے ہیں۔

قلعے کی دنیا بھی کیا دنیا ہے! باہر کی ہوا اندر آنے کو سکتی ہے اور اندر کی آوازیں پہاڑ دیواروں سے ٹکرا کر اندر ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ اس میں بڑے سے بڑا کھنچال مرد دنوں میں ابرو کے اشارے پر ہیجڑوں کی تالیاں بجانے لگتا ہے۔

میرے کندھے پر ایک اور چمکتے ستارے کا اضافہ ہوا...... میرا تبادلہ جیل میں کر دیا گا...... شیروں کا شکاری نچی ہوئی مرغیوں کے کھدیڑنے پر آگا...... بہر حال نوکری نوکری ہے۔

مجھ سے پہلے قلعہ جیل پہنچ چکا تھا۔

گاڑی فرلانگ بھر دور ہوتی ہے تو جیل کا آسمانی گیٹ کھلنے لگتا ہے اور اکڑے ہوئے سیلوٹوں کے ساتھ لاتعداد ایڑیاں زخمی ہونے لگتی ہیں۔

ماتحت عملہ سدھر چکا تھا...... آج قیدیوں کا پہلا معائنہ تھا۔

میں گن بردار' سخت چہروں والے محافظوں کے جلو میں پورے طمطراق سے ٹھنڈے دفتر سے نکلا...... جیلر میرے ساتھ بھوکے بچھڑے کی مانند اچھلتا کودتا چل رہا تھا۔

میدان میں سورج انتہائی تکبر سے ظلم ڈھا رہا تھا...... قیدی صبح سے قطار در قطار کھڑے تھے...... ہر برج میں سپاہی سیاہ نالیوں والی بندوقیں تانیں مستعد تھے...... لطف آ گیا۔

پہلا قیدی ایک جھڑتا ہوا بوڑھا تھا...... وہ بار بار کھلی آستین سے اپنا چہرہ پونچھے جا رہا تھا۔ اس کی گدلی صحرائی ڈاڑھی بری طرح سے الجھی ہوئی تھی۔

جیلر نے لپک کر میرے کان میں پھونکا۔

"سر ذہنی مریض ہے۔"

اس نے ایک بار بھی آنکھیں اٹھا کر میری طرف نہ دیکھا۔ اس کے لئے دنیا میں اہم ترین چیز اسکا چہرہ تھا...... وہ اسے مسلسل چھیلے جا رہا تھا۔

معائنے کی ابتدا تھی...... قیدیوں کے لئے رویے کا تعین کرنا تھا...... اگر وہ بوڑھا تھا اور ذہنی مریض تھا تو جیلر کو خیال کرنا چاہئے تھا...... وہ پہلی قطار میں پہلا آدمی نہیں ہونا چاہیے تھا۔

میں نے چمکتی بید کی نوک اس کی ٹھوڑی تلے دیکر اسکا جھکا سر اٹھایا...... اس نے بس ایک جھپک میری طرف دیکھا...... اسکی آنکھوں میں برفانی خلاء تھا اور اس خلا میں کہیں کسی جذبے کا ایک سوکھا' مریل کانٹا تک نہ تھا۔

میں نے چھپ چھپ پانچ سات بید جڑ دیئے...... نہ کوئی رگوں میں خون اچھالنے والی چیخ...... نہ رحم کی بھیک مانگتی گڑگڑاہٹ...... سارا مزہ کرکرا کر کے رکھ دیا...... مار کھانے کے بعد بھی اس کی ڈھیلی آستین کار کے وائپرز کی طرح متواتر اس کے چہرے پر پھر رہی تھی۔

زندگی سے بچھڑے چہرے' مٹی کے بھربھرے مجسمے...... ان کا کیا معائنہ کرتا!

کم از کم پہلی قطار تو پوری ہو جائے...... میں جلدی جلدی' اچٹتی نظر ڈالتا آگے بڑھا چلا جا رہا تھا...... میرا جلوس بھی ساتھ ساتھ رینگ رہا تھا...... سب کو پسینے کی چیونٹیاں کاٹ رہی تھیں...... خود میری وردی جگہ جگہ سے بھیگنے لگی تھی

میں بس واپس مڑنے کو تھا...... میرے پاؤں زمین سے چپک گئے۔

وہ پہلی قطار میں سب سے آخر میں کھڑا تھا...... مجھ سے نکلتا قد...... مجھ سے زیادہ مضبوط اور تنے ہوئے کندھے...... جھاڑ جھنکار باغی مونچھوں کی الف نوکیں۔

میں نے حاکمیت کے بے رحم خنجر اس کی آنکھوں میں گاڑ دیئے اور اس کے رد عمل کا انتظار کرنے لگا۔

اس کی پتلیوں پر جمی تمسخر اور حقارت کی تہیں پگھلنے کی بجائے اور گھنی ہو گئیں...... مجھے ایسے ہی جی دار کی تلاش تھی......اور ملا کہاں؟ نچی مرغیوں کے دڑبے میں...... ایسا شیر تو قلعے میں پایا جا سکتا ہے۔

لذت میری رگوں میں پھنکاریں مارنے لگی......اس کے خوشگوار ذائقے سے سارا بدن مہک اٹھا۔

طبل جنگ بج گیا تھا...... میرے اندر قلعے کا پروردہ اندھا' پاگل جن میدان میں کود پڑا۔

جیلر کچھ کہنے سمجھانے آگے بڑھا...... جن نے اسے دھکا دیکر ایک طرف دھکیل دیا۔

بید لچک لچک کر سن سن ہوا کو کاٹتا اس کے جسم پر برسنے لگا......وہ ہر نئی ضرب پر پیچھے ہٹنے یا سمٹنے کی بجائے پہلو بدل بدل کر جسم کا کوئی دوسرا حصہ سامنے کر دیتا...... کبھی ایک کندھا' کبھی دوسرا' کبھی پیٹھ' کبھی سر...... جیسے ٹھنڈے بدن عضو عضو تاپ رہا ہو۔

مجھے احساس ہوا کہ میں بے وقوف بن رہا ہوں...... میرے ہاتھ ڈھیلے پڑنے لگے ...... پھر رک گئے۔

اس کے سرکش سر میں خم آگیا تھا...... اس کے ہونٹوں سے خون اور تھوک میں لپٹی لذت بھری سسکاریاں پھولوں کی مانند جھڑ رہی تھیں...... وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر پھیر کر لذت کے آخری ذرے چاٹ رہا تھا۔

میں نے ہمت کر کے اس کی آنکھوں میں نقب لگائی۔

تمسخر اور حقارت کی دبیز تہیں پگھل کر بہہ گئی تھیں...... وہ مجھے بڑی اپنائیت اور پیار سے گھور رہا تھا۔

"بس...... ابھی تو نشے کا پہلا ریلا آیا ہے...... بڑی جلدی تھک گئے ہو"

میں دیوانہ وار ایک اور حملے کو لپکنے والا تھا...... جیلر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے انتہائی کرب اور دکھ سے اپنے جن کو واپس بوتل میں ڈالا...... اور اس سے پہلے کہ میری بے بسی قیدیوں میں پھیل جائے' میں پلٹا اور تقریباً بھاگتا ہوا دفتر کی طرف چل پڑا...... میرا ادبوٹوں کا جلوس میرے پیچھے پیچھے تھا۔

میرا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر تھا...... جھکے پھیکے چہروں اور خالی آنکھوں نے اتنا بھرپور قہقہہ لگایا کہ میرے کندھے پر جگمگاتے سارے ستارے ٹوٹ کر زمین پر گر گئے...... میں نے جلدی سے اپنے اجڑے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا۔

ٹھنڈے کمرے میں کنوئیں سے گہری کرسی کے اردگرد میری شکست برہنہ رقص کر رہی تھی۔

میں جیلر پر چیخا۔

"یہ کیا چیز پال رکھی ہے؟ مجھے پہلے سے باخبر کیوں نہیں کیا گیا۔"

"سر...... سر......"

جیلر کے گلے میں غلامی کا پھندا تنگ ہو گیا...... مجھے نجانے کیوں اس پر رحم آگیا حالانکہ یہ لفظ کبھی بھی میری ڈکشنری میں نہیں رہا

میرے ماتھے کی شکنیں دیکھ کر اسکی آواز بحال ہوئی۔

"سر...... یہ بھی ذہنی مریض ہے...... یہاں سبھی ذہنی مریض ہیں' تشدد اسکی غذا ہے سر...... اذیت اس کا نشہ بن چکا ہے"

میں نے بید پوری بے دردی سے میز پر ماری...... میز پر بچھا شیشہ چھناکے سے چکنا چور ہو گیا۔

میں نے جلدی جلدی لمبی لمبی سانسیں لیں...... پھیپھڑوں کو خوب بھرا......

گارڈ اور جیل کا دوسرا عملہ باہر کھڑا تھا میں نے گھنٹی پر انگوٹھا رکھ دیا۔

پلک جھپکنے میں گارڈ اندر داخل ہوا...... اس کی ایڑیاں بجیں...... میں نے جھک کر اپنے چمکتے جوتوں پر ہلکے سے بید مارا۔ "چائے۔"...... گارڈ ویسے ہی جتا جاتا لوٹ گیا۔

"بیٹھ جایئے۔"

وارڈن کے مردہ جسم میں زندگی اتنی سرعت سے داخل ہوئی کہ وہ لڑکھڑا کر کرسی پر تقریباً گر گیا۔

میں نے اس کی طرف غیر ملکی سگریٹ کا پیکٹ بڑھایا...... آخر یہ بھی انسان ہے۔

وارڈن نے ایک سگریٹ تبرک کی طرح لے لیا۔

سگریٹ کے لمبے کش اور چائے کی بدتمیز سرکیوں نے اسے کافی حد تک ڈھیلا کر دیا۔

"سر میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں...... آپ نے ٹہلتے ہوئے اسے غور سے دیکھا تھا؟ وہ اپنے جسم کی سینکائی کر رہا تھا' ہمارے پاس ایک ہی ہتھیار ہے...... یہ اس پر کارگر نہیں...... ہم اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں...... سارا ڈسپلن تباہ و برباد ہو جائیگا۔"......

مجھ پر مایوسی غالب آنے لگی تھی۔

جیلر میری الجھی سوچوں سے بے نیاز چائے' سگریٹ اور اس اعزاز میں ہلکورے لے رہا تھا...... میں نے سوال داغا تو وہ اچھے خاصے جھٹکے سے واپس لوٹا۔

"تم لوگ اس قیدی پر اکثر تشدد کرتے رہتے ہو؟"

"نو سر...... یس سر...... آجکل تو بالکل نہیں کر رہے تھے...... شروع شروع میں یہ قیدی بیچ میدان کھڑا ہو کر اچانک بھیانک آواز میں چیختے چلانے لگتا تھا...... کوئی گارڈ دو چار تھپڑ' دو ایک ٹھوکریں لگاتا تھا...... اور وہ چپ چاپ اپنی کوٹھڑی میں چلا جاتا تھا...... پھر سر آہستہ آہستہ اس کی ضرورت بڑھنے لگی' بڑھتی چلی گئی۔"

"پھر!"

میرے تجس کو تپنگے لگ گئے

جیلر نے اپنی آنکھیں مجھ سے چھڑالیں۔

"سر..... اسے دوسرے نشوں پر ڈالنے کی کوشش کی۔ چرس، کوکین اور آخر میں ہیروئن'..... سب کچھ آزمایا..... حرامی نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا..... بس تشدد مانگتا ہے سر اذیت مانگتا ہے..... پھر بے بس ہو کر اسے اسکے حال پر چھوڑ دیا۔"

"آج کل کیسے گزارہ چل رہا ہے؟"

"بس سر..... پہلے تو خوب چیختا چلاتا ہے..... کوئی توجہ نہیں دیتا تو ہر گزرنے والے کو ننگی گالیاں دینے لگتا ہے۔ پھر بھی کام نہ ہو تو کس کا گریبان پکڑ کر چاک کر دیتا ہے۔ آدمی کہاں تک برداشت کرے۔ غصے اور نقصان میں نادانستہ طور پر اس کا کام ہو جاتا ہے..... ایک نمبر حرامی ہے سر..... نشہ پورا ہو جاتا ہے تو گڑگڑا کر' معافیاں مانگ مانگ کر مارنے والے کو شرمندہ کر دیتا ہے..... آج کل اسی مکاری پر کام چلا رہا ہے"

"کبھی اسے قید تنہائی میں بھی رکھا ہے؟"

"یس سر..... دیواروں سے ٹکریں مار مار کر بھیجا پلپلا کر لیا..... اب اگر وہاں مر جاتا تو....."

میں جیلر کی بات سمجھ رہا تھا..... اگر وہ اس طرح مر مرا جاتا تو الزام جیل والوں پر آتا اور پھر.....

میں نے اچانک فیصلہ کیا۔

"جیلر صاحب..... اس کے پاؤں باندھ کر اسے کھلے میدان میں ڈال دیا جائے..... ایک گارڈ مستقل اسکے سر پر کھڑا رہے..... کوئی بھی، کسی صورت میں بھی اسکے قریب نہ آئے..... کوئی اس پر ہاتھ نہ اٹھائے..... ہم اس کے نشے کو بھوکا رکھ کر ماریں گے۔"

میرے کندھے پر جگمگاتے ستارے واپس لوٹ آئے تھے۔

میں اٹھ کھڑا ہوا..... جیلر نے لپک کر دروازہ کھول دیا۔

باہر نکلتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں ایک اور بات آئی۔

”جیلر صاحب...... کل اس مجرم کی فائل میری میز پر ہونی چاہئے“

میں رات بھر الجھا رہا...... ولایتی وسکی پانی ہو رہی تھی...... میں پئے جا رہا تھا۔

”کیا ایسا ممکن ہے...... ؟ سانپ ڈسوا کر نشہ کرنے کا سن رکھا تھا لیکن تشدد......“

دوسرے دن ایک سلسلے میں ہائی کورٹ میں پیش ہونا تھا...... اس جگہ سرکاری افسروں سے مجرموں جیسا سلوک کیا جاتا ہے...... فارغ ہوا تو ذہن پر اتنا بوجھ تھا کہ جیل جانے کو جی ہی نہ چاہا۔

کھانے کی میز میں اپنی بیوی اور چہکتے بچوں کی جنت میں باہر کی زندگی یکسر فراموش کر چکا تھا۔

اچانک فون کی گھنٹی چلانے لگی۔

نوکر نے فون اٹھا کر سنا اور پھر میری طرف بڑھا دیا۔

”سر...... جیل سے ہے۔“

ہزاروں بڑے چھوٹے خدشات گولیوں کی طرح ذہن پر برسنے لگے...... قیدیوں کی بغاوت، فرار، اچانک کسی نا اہل افسر کا معائنہ......

میں نے ہیلو کیا...... دوسری طرف جیلر رو رہا تھا۔

”سر...... سر فوراً آئیے...... اس قیدی کی حالت نازک ہے وہ مر رہا ہے سر...... یا پھر اجازت دیجئے“

راستے بھر خوف مجھے مختلف انداز میں مروڑتا رہا...... اگر وہ مر گیا تو...... انکوائری، رشوتیں، سفارشیں......

وہ کچی ریتلی زمین پر تازہ ذبح بکرے کی طرح تڑپ رہا تھا...... بندھے ہاتھ پاؤں لڑھکنیاں کھا رہا تھا...... چیخ چیخ کر، رو رو کر اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔

اس نے مجھے دیکھا اور تیزی سے لڑھکتا ہوا میرے قدموں میں آ پڑا۔

”اتنا ظلم نہ کیجئے...... رحم، رحم سرکار۔“

میں نے اسے ایک ٹھوکر لگائی...... اسکے تڑپتے ہاتھ پاؤں سنبھل سے گئے......

میں نے اسکے سر پر ایک بید لگائی...... وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"نوالہ...... نوالہ ڈالتے ہو...... کھلا کھانا کھلا دو...... یا پھر مار ڈالو۔"

وہ واقعی رحم کا مستحق تھا...... یا پھر جیل میں آکر مجھے رحم کی بیماری لگ گئی تھی۔

میرے اشارے پر ایک گارڈ پوری بے رحمی سے اس پر ٹوٹ پڑا۔

جب گارڈ تھک کر 'نڈھال ہو کر رکا تو میں نے خود اپنے ہاتھ سے اس کی رسیاں کاٹیں...... وہ بے جان ٹوٹے مجسمے کی طرح بکھرا پڑا تھا...... اسکے چہرے پر بے پناہ آسودگی تھی۔

ذہن میں ایک عجیب سی بے کلی تھی...... کچھ سمجھ نہ آرہا تھا...... گھر جاؤں یا دفتر میں بیٹھوں...... جیلر نے مسئلہ حل کر دیا۔

"سر اس کی فائل میں نے آپ کی میز پر پہنچادی ہے"

میں نے فائل کھولی۔

پہلا صفحہ ...... نام

مجھے اس کے نام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

گرفتاری...... تاریخ درج تھی۔

جرم...... مارشل لاء کے دوران طالب علموں کو بغاوت پر اکسا تا رہا تھا۔

شاہی قلعے میں تین سال...... پھر چودہ سال کی سزا...... ایک جیل سے دوسری جیل۔

ساری الجھنیں جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں...... میں نے فائل جیلر کی طرف بڑھا دی۔

"جیلر صاحب...... قیدی کو صبح شام بلاناغہ پورے احترام کے ساتھ اس کا نشہ مہیا کیا جائے...... اس میں کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کی جائے گی۔"

جیلر آنکھیں سیکڑے عجیب نظروں سے مجھے گھورے جا رہا تھا۔ 'میں پاگل نہیں ہوں...... ہم دونوں شاہی قلعے کے پروردہ ہیں...... میرا اور اسکا ایک رشتہ ہے۔'

بوڑھا اور سایہ

بوڑھا پگ ڈنڈی کے عین بیچ میں دھرنا دے کر بیٹھ گیا۔

وہ ایک طویل اور کٹھن سفر کے سارے عذاب جھیل کر یہاں تک پہنچا تھا۔

اسکے سانسوں میں بڑھاپا بج رہا تھا اور اس کے جسم کے اعضا زرد پتوں کی طرح بے جان اور بے رونق تھے۔

اسکے ذہن میں بار بار ایک ہی سوچ گونج رہی تھی۔

'احمق بوڑھے...... اب جا کر خیال آیا ہے؟'

اس نے اپنا خمیدہ سر اور جھکا لیا۔

'جوانی' وحشی' منہ زور جنگی گھوڑے کی طرح خود ہی خود اڑتی چلی گئی میرے بس میں کب تھی۔ دم بھر کو کہیں سانس لینے کو رکتی' تو کسی اور طرف دھیان جاتا۔'

بہت کچھ چلا گیا ہے' لیکن سب کچھ تو نہیں گیا۔'

اس نے اپنی دھندلی آنکھیں دور پہاڑیوں پر گاڑ دیں۔

ان پہاڑیوں کے پیچھے کیا ہے...... وہاں سے ہر روز نیا روشن سورج طلوع ہوتا ہے پھر بھی ہر شے تاریکی میں ہی لپٹی ہے' کیا یہ ممکن نہیں کہ میں ایک صرف ایک نظر ادھر جھانک سکتا۔

پھر اس نے رخ پلٹا اور اپنے پیچھے دیکھنے لگا۔ زمین اور آسمان ایک دوسرے کی آغوش میں سوئے تیزی سے اس کی طرف بڑھے چلے آرہے تھے۔

"دو تاریکیوں کے درمیان تیز روشنی میں چندھیائی آنکھوں کو کیا دکھائی دے گا! اور پھر اس تیز روشنی میں بھی جا بجا تاریک جزیرے بکھرے ہیں۔ اف بے چارہ میں......"

پہاڑیوں کی اوٹ سے آخر کار سورج نے سر اٹھایا...... بوڑھے کے ارد گرد' چاروں طرف سہمی ہوئی' نرم روشنی بکھرنے لگی...... اور اس کے ساتھ ہی اندھا دھند' سرپٹ دوڑتے قدموں کی تیز چاپ ہر طرف کوڑوں کی طرح برسنے لگی۔ وہ اپنے بلبلاتے جوڑوں کو بھول کر تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ درد کی شدت سے اسکے منہ سے تیز کراہ نکل گئی۔ لیکن وہ پورے قد تن کر کھڑا ہو گیا۔

پھر اس کی دھندلی آنکھوں نے اسے دیکھ لیا۔

ایک بے وجود سایہ...... نہ روشن نہ تاریک...... بجلی کے کوندے کی مانند کڑکتا' لپکتا' سرپٹ بھاگتا چلا آرہا تھا۔ بوڑھے نے دونوں بازو پھیلا کر اس کا رستہ روک لیا۔

سایہ جوں ہی اسکے قریب پہنچا' اس نے بھرپور' جوان چھلانگ لگا کر دونوں بازو اس کی گردن میں اور ٹانگیں اس کی کمر میں الجھا دیں۔

اس مشقت سے اس کی سانس زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگی' اس کے خشک جوڑ چیخیں مار کر رونے لگے۔ دونوں دھڑام سے سخت زمین پر آگرے۔

بوڑھے کی بجھی آنکھوں میں کامیابی کی قندیلیں جل اٹھیں۔ اس نے بڑے غور سے اپنے شکار کا جائزہ لیا۔

اچانک قندیلیں بجھ گئیں۔

"کہیں یہ بدمعاش میرے اندر سے گزر کر آگے نہ نکل جائے۔' اس نے اپنی

گرفت مزید مضبوط اور تنگ کر دی۔ سایے کے چہرے پر مکمل سکون اور اطمینان تھا' بلکہ اس کے ہونٹوں کے کونوں پر ہلکی طنزیہ مسکراہٹ تھر تھرا رہی تھی۔

وہ بالکل نو عمر تھا۔ اس کے اوپر والے ہونٹ پر ہلکی سی دھند کا شبہ ہوتا تھا۔ دبلا پتلا شہتوت کی ٹہنی سا جسم جو صرف اور صرف سرپٹ دوڑنے کے لئے وجود میں آیا تھا۔

سائے نے ایک کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا۔ اس قہقہے کی آواز چاروں اطراف دور دور تک پھیل گئی اور پھر واپس انہیں کے پاس لوٹ آئی۔

"بڑے میاں۔ یہ تمہیں کیا سوجھی ہے؟ مجھے کیوں جکڑ رکھا ہے؟"

"میں ایک مدت سے تمہارا منتظر تھا۔ اب تم میرے قبضے میں ہو' میں ہمشیہ زندہ رہونگا۔"

بوڑھے کی جھریوں سے جوان مسکراہٹ پھوٹ رہی تھیں۔ سایہ اسے دلچسپی سے دیکھے جا رہا تھا۔

"آداب ملحوظ رکھو چھوکرے"

سایے نے یکے بعد دیگرے کئی قہقہے لگائے۔

"تم بھول رہے ہو۔ میں عمر میں تم سے کھربوں سال بڑا ہوں...... مجھ پر تمہارا ادب واجب نہیں ہے۔"

بوڑھا کافی دیر اپنی داڑھی مسلتا رہا...... پھر اثبات میں سر ہلانے لگا۔

سایہ اسے متجس اور حیران آنکھوں سے پڑھتا رہا......

"اچھا...... اب بتاؤ تمہارے کیا ارادے ہیں؟"

"میں پورا انتظام کر کے چلا تھا۔ تمہیں اس درخت سے باندھ کر رکھونگا' ہمیشہ ہمیشہ' میرا تمہیں تکلیف دینے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں ہے۔ مجھے تمہیں صرف روکنا ہے۔"

سایے کو اس بوڑھے سے ہمدردی ہونے لگی۔

مجھے اپنی ان خشک ٹانگوں اور خاردار بازوؤں سے آزاد کر دو۔ چلو باندھنا ہے تو باندھ بھی لو...... لیکن اگر نہ بھی باندھو گے تو بھی میں نہیں بھاگوں گا۔"

بوڑھے کو اس پر ذرہ برابر بھروسہ نہ تھا۔ اس نے اپنے تھیلے سے مضبوط لمبی رسی نکالی۔ پھر سایے کو گود میں اٹھائے اٹھائے درخت تک لایا اور اسی کے کئی بل دیکر اسے تنے سے جکڑ دیا۔

اسی دوران سایے کے دھندلے چہرے پر مسلسل ایک پراسرار مسکراہٹ کھیلتی رہی۔

بوڑھا چڑ گیا۔

"تم پریشان کیوں نہیں ہو؟ میں نے تمہیں روک دیا ہے اور تم مسکرائے جا رہے ہو!"

سایے نے جواب دینے کی بجائے خود سوال کر دیا۔

"اس بھرے بھرے جسم کے ساتھ تمہیں ہمیشہ زندہ رہنے کی ہوس کیوں ہے؟ تم تقریباً اپنا وقت پورا کر چکے ہو۔ اب تمہاری جگہ کوئی اور لے گا...... یہ فطرت کا اٹل قانون ہے"

بوڑھے کے تھرتھراتے ہونٹوں سے جھاگ اڑنے لگی۔

"فطرت کے قوانین مجھ سے مشورہ کر کے نہیں بنائے گئے...... جب انہیں مجھ پر استعمال ہونا تھا تو مجھ سے بھی مشورہ کیا جانا چاہئے تھا۔"

سایے پر پہلی مرتبہ سوچ نے حملہ کیا۔ اسے اس قسم کے جاندار سے پہلی بار ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ لیکن جلد ہی سوچ کی لکریں غائب ہو گئیں اور اسکا اعتماد واپس لوٹ آیا۔

"تمہیں یہ خیال اتنی دیر سے کیوں آیا؟"

بوڑھا کافی دیر اپنے اندر کی گہری تہیں کرید تا رہا۔

"بچپن نیم مدہوشی تھا' جوانی مصروف اور مگن...... ہر طرف' قدم قدم پر منڈلاتی موت کبھی دکھائی ہی نہ دی۔ اب نہ ہونے کی اذیت اتنی شدید ہے کہ لولی' لنگڑی زندگی بھی غنیمت ہے...... میں اس کے لئے جنگ لڑونگا۔"

سایے کا جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر اس بوڑھے کا منہ چوم لے۔ وہ اسکی ہمت اور

عزم پر ششدر تھا۔ اسے ازل سے آج تک کسی نے اس طرح چیلنج نہ کیا تھا.....وہ پہلا آدمی تھا۔

بوڑھا سایے کے اندر ابلتے لاوے سے بے خبر اپنی رو میں بڑبڑاتا جا رہا تھا۔

اسے افسوس تھا کہ وہ اسکے لئے کچھ نہیں کر سکتا' وہ خود بھی اتنا ہی بے بس تھا جتنا یہ اکیلا بوڑھا۔

"میں یہیں جھونپڑی ڈال لونگا۔ جنگل کے درخت پھلوں سے لدے ہیں۔" بوڑھے کی آنکھوں کی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔

"انہیں کھا کر ہم زندہ رہیں گے' رہتے چلے جائیں گے' ہمیشہ ہمیشہ......"

اسکے کچے چمڑے جیسے چہرے پر سے جھریوں کا جال سٹنے لگا تھا اور عمر کے تکلیف دہ سال جھڑنے لگے تھے۔

بوڑھا صبح صبح اٹھتا' رسیوں کا جائزہ لیتا' سایے کو پیار بھری نظروں سے تھپکتا اور جنگل کی راہ لیتا۔

خاردار جھاڑیوں اور دوسری رکاوٹوں کی پروا کئے بغیر وہ چلتا جاتا اور پھر ایک طویل عرصے بعد لوٹتا تو اس کی جھولی پھلوں سے بھری ہوتی۔

واپسی پر سب سے پہلے وہ دیکھتا کہ سایہ کہیں بھاگ تو نہیں نکلا۔ اسے موجود پا کر' اطمینان سے ایک ایک پھل اپنے دامن سے پونچھ کر صاف کرتا اور اسکے منہ میں ڈالتا۔

سایے کو بوڑھا اچھا لگنے لگا تھا۔ اس نے کئی بار کہا کہ وہ اس کی رسیاں کھول دے' وہ خود اس کے لئے جنگل سے غذا ڈھونڈھ کر لایا کرے گا۔ اسے بوڑھے کو اس طرح مشقت کرتے دیکھ کر تکلیف ہوتی تھی۔

ایک دن بوڑھا اسکے پاس بیٹھا اسے اپنی جوانی کے رنگین قصے سنا رہا تھا اور اپنی رانوں پر ہاتھ مار مار کر خوب زور زور سے ہنس رہا تھا کہ اچانک اسکی سانس رکنے لگی۔

سایہ تیزی سے اسکی طرف لپکا اور اسکو اپنی آغوش میں بھر لیا۔ اس کی رسیاں خود بخود ٹوٹ گئی تھیں اور وہ مکمل طور پر آزاد تھا۔

بوڑھے کی ڈوبتی آنکھوں میں بے یقینی تھی' اس نے ڈوبتی آواز میں سائے سے شکایت کی۔

تم نے مجھے دھوکے میں رکھا۔ تم درخت کے ساتھ بندھے تھے پھر بھی دوڑ رہے تھے۔ تمہیں مجھ کو بتادینا چاہیئے تھا۔"

بوڑھے نے آخری ہچکی لی اور اسکا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

سائے کی آنکھوں کے سامنے ہلکی سی دھند تھی۔ اس نے آنکھیں پونچھیں' ایک نظر اس درخت پر ڈالی جس سے وہ کچھ عرصہ بندھا رہا تھا...... پھر وہ بوڑھے کے مردہ جسم پر جھکا...... اور اس کی ٹھنڈی پیشانی پر ایک طویل بوسہ دیا۔

"میں رک ہی نہیں سکتا' اس لئے کہ میں رواں دواں ہوں۔"

اس نے پگ ڈنڈی پر اپنی دوڑ لگا دی۔

لمبا، گرم موسم

مہینوں سے اس حرام کے جنے اسپتال کی بو سو سونگھ رہا ہوں

اگر ان بھبھناتی، اتراتی مکھیوں پر ایک سانس چھوڑ دوں تو ایک بھی نہیں بچے گی۔ کیا فائدہ! پیتھاڈین کے گھنے جنگل میں بھنچے گلے والی آوازیں مسلسل پہنچ رہی تھیں۔

اس کی بوڑھی، غیر شادی شدہ بیٹی سامان سمیٹ رہی تھی۔

اس کی شادی ہو جاتی تو اطمینان سے مر جاتا۔

وہ جانتا تھا کہ وہ ست رنگا جھوٹ بول رہا ہے پھر بھی ایک طاقتور جھر جھری اسے جھنجھنا گئی۔ اس کی بیٹی کی سات شادیاں ہو جاتیں تو بھی وہ مرنے کو تیار نہ تھا حالانکہ اسے ستر واں سال لگ گیا تھا۔

ابھی تک سرکاری پینشن...... گورنمنٹ کو لوٹ لوٹ کر عیش کر رہا ہوں۔

اس کے کچے چمڑے جیسے کھردرے چہرے پر تلخی اور نفرت جڑواں بہنوں کی طرح مل بیٹھی تھیں۔

'ڈاکٹر...... کہہ گیا ہے کہ گھر لے جائیں۔'

وہ اندر سے لرز اٹھا تھا۔

"کتنے دن رہ گئے ہیں؟"

ڈاکٹر کے چہرے پر جائے نماز بچھی تھی۔

"بہن...... گھبرانے کی بات نہیں، عید کے بعد نئی ڈرگ ٹرائی کریں گے۔"

'ڈاکٹروں کو کالجوں میں جھوٹ بولنے کی بڑی عمدہ تربیت دی جاتی ہے۔'

کینسر اس کے جسم میں آکاش بیل کی طرح پھل پھول رہا تھا۔ ایک عرصے سے ندیدی موت ہونٹ چاٹتی اس کے اردگرد منڈلاتی رہتی ہے۔

دھند کے غلاف میں لپٹا کوئی اجنبی چہرہ اس کی بیٹی سے گفتگو کر رہا تھا۔

اس اجنبی نے منہ تک بھری پلاسٹک کی ٹوکری اٹھالی...... اس کی بیٹی نے تھرماس بھی اس کے خالی ہاتھ میں دے دی۔

وارڈبوائے وہیل چیئر بستر سے لگا چکا تھا...... اس کی آنکھوں سے حرص میں لتھڑی ہمدردی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

وہ ایمبولینس میں اکیلا پڑا تھا۔

"یہ ہر کسی کو آخر میں مرنا کیوں ہوتا ہے؟ اس حرام کے جنے کی ہڈیاں بھی کھاری مٹی ہو گئی ہونگی۔

نرسیں وارڈبوائے اور بھنگنیں اس کی بیٹی کے سفید بالوں کی کمائی لوٹ رہے ہونگے۔

اسپتال کی مکھیاں اسے ایمبولینس تک الوداع کہنے آئی تھیں اور مسلسل اس کے چہرے، ہاتھوں اور جسم کے ننگے حصوں کو بوسے دیئے جا رہی تھیں۔

"وہ حرام کا جنا بتا جاتا تو اس کا کیا جاتا؟ میں اس سرکاری بوچڑ خانے کی بجائے کسی ٹھنڈے پرائیویٹ اسپتال میں آرام کر رہا ہوتا...... اور میرے دونوں بیٹے دوسرے حرام کے جنوں کی طرح پڑھ لکھ کر بڑی کرسی پہ ہوتے یا پھر کوئی انڈسٹری چلا رہے ہوتے۔"

اس کی بیٹی لٹ پٹ کر اس کے سامنے والی سیٹ پر آبیٹھی۔

'یہ اس خوفناک جنگل میں سیجوں کے بغیر کیسے جیئے گی؟ پرائمری اسکول کی ٹیچر...... ابھی جانے کہاں کہاں سے بھیک جمع کر کے لائی ہے...... وہ دونوں حرام کے جنے اپنی ضرورت کی ہنڈیا کا پیندا کھرچ کھرچ کر کچھ بھیج ہی دیتے ہیں۔ وہ بھی کیا کریں مزار پر رقم ضائع کرنے کا فائدہ! میں کچھ عرصہ پہلے مرجاتا تو سب کے لئے بہتر ہوتا۔

میں بار بار جھوٹ کیوں بولتا ہوں!

ایمبولینس اتنی تیز کیوں چل رہی ہے؟ تیسری دنیا کی کرپشن کے ہاتھوں لٹی سڑک کو بھی حصہ دینا ہوتا ہے ایک زوردار جھٹکا اسے اچھال دیتا ہے۔

ڈرائیور اور سڑک دونوں اندھے ہیں۔

اس کی بیٹی نے لپک کر اسے گرنے سے بچالیا۔

بال جلدی سفید ہو گئے ہیں۔

اس نے بیٹی کی ویران تھکی آنکھوں میں نقب لگائی...... وہاں اکتاہٹ اور بے بسی کا تاریک گھنا جنگل بسا تھا۔

آدمی کی آنکھیں نہیں ہونا چاہئیں ... وہ حرام کا جنا ابھی بھی ویسے ہی قہقہے لگا رہا ہے...... لیکن اسے کیا ملا...... مجھے تو سب کچھ مل سکتا تھا۔

لوہے کی موٹی سلاخوں میں دو لمبی ٹکریوں میں بٹا چہرہ بالکل اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

"سنتری بادشاہ...... سگریٹ پلاؤ۔"

وہ سگریٹ کا عادی نہیں تھا، بس کبھی کبھار اس سے مانگ لیا کرتا تھا۔

قیدی نے سگریٹ آہنی سلاخ پر بجایا اور ایک زوردار قہقہہ چھوڑ دیا۔

'یہ مرا ہوا بھی ہنستا ہے...... ابھی وارڈن آنکلا تو میری جان کھائے گا۔'

"تمہارا دل بھربھری مٹی ہے، دو بوندیں برسیں اور چھلنی...... نوکری چھوڑ کر بیرہ گیری کرلو"

''سنتری بادشاہ...... یہ سگریٹ جلے گی کیسے ؟''

قیدی نے اس سے ماچس لیکر سگریٹ جلائی اور خوب پھیپھڑے بھر کر دھواں لیا...... اسکے چہرے پر قہقہہ ابھی تک جما بیٹھا تھا۔

''سنتری بادشاہ تم یہ پولیس کی نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتے ؟ اگر میں اپنے آپ کو آگ لگالوں تو...... گئی نا تیری نوکری ؟''

''پھر وہی وارڈن والی بات...... میں کیا سچ مچ احمق ہوں ؟ پندرہ سال پہلے جس گڑھے سے نوکری شروع کی تھی' ابھی تک وہیں پڑا ہوں...... دوسرے کہاں سے کہاں......''

''گھبراؤ نہیں...... میں تمہارے بیوی بچوں کا دشمن نہیں ہوں...... یہ لو ماچس' واپس''

سنتری نے ابلتے ذہن کو مٹھی میں بند کر رکھا تھا...... مٹھی پھٹ سے کھل گئی۔

''میں نے پولیس والا ہو کر بھی ہمیشہ تمہیں بھائی سمجھا ہے۔''

قیدی کی آنکھوں میں تمسخر دیکھ کر اس کی زبان رک گئی۔

''سنتری بادشاہ...... چھوڑ دے اس بات کا پیچھا...... چھوڑ دے...... دوستی خراب نہ کرو۔''

حرامی الدہر...... چلو آدمی مار دیا...... اس کی لکھی ہی اتنی تھی...... لیکن اتنی بڑی رقم......''

اس کا غصہ بہہ گیا......اسے پھر سے اس جوان مرتے جسم سے ہمدردی ہونے لگی۔

اس نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔ ابھی تو اس کی زندگی کی مسیں بھی ٹھیک سے نہیں بھیگیں۔''

''میں خدا اور رسول کو حاضر ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں...... ایک پیسہ اپنے لئے نہیں رکھونگا...... جس کو کہو گے پہنچادونگا۔''

یہ حرام کا جنا...... میری آنکھیں' میری آواز سب پڑھ لیتا ہے۔'

اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا...... قیدی کا نیا قہقہہ اس کے پیچھے پیچھے آیا۔
"اگر میں پوری رقم کا تمہیں بتادوں اور تمہیں دے بھی دوں تو کیا کرو گے ؟"
اس کی خون کی نالیوں میں ہر قطرہ بجنے لگا۔
"نہیں بھائی...... سب مجھے نہ دو...... آدھی اپنے آگے پیچھے والوں کے لئے رکھ لو...... میں پہنچادونگا۔ اور اگر تم ساری مجھے دینا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی...... میں سب سے پہلے حج کو جاؤنگا...... پھر بچوں کو انگریزی اسکول میں داخل کرواؤں گا...... پھر رشوت دیکر ترقی...... پھر......"

قیدی کی شریر مسکراہٹ نے اس کی زبان پکڑ لی۔
'یہ حرام کا جنا ہمیشہ کی طرح پھر میرا مذاق اڑا رہا ہے'
"جہنم میں جاؤ تم اور ر تمہاری حرام کی رقم......"
قیدی یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں گہرے سمندروں میں ڈوب گئیں۔
"تم تو ناراض ہو گئے...... کیا کرو گے خون میں رنگی ہوئی رقم...... تم مجھے اچھے آدمی لگتے ہو"

"میں حرام کا جنا ہوں...... مجبور' لاچار پھیسے لیموں نچوڑتا ہوں...... اپنے گھر والوں کو شروع دن سے حرام کھلا رہا ہوں۔ اب بولو۔"
قیدی ڈہ گیا تھا...... وہ سلاخوں سے ہٹ کر اپنے بستر پر جا بیٹھا تھا۔
"سنتری بادشاہ...... چلو وعدہ رہا۔ میں تختے پر جانے سے پہلے تمہیں رقم کا بتادوں گا۔"

ایک بار پھر اس کی خون کی نالیوں میں سیلاب آ گیا۔
"تمہیں خوف نہیں آتا...... میں تم سے دگنی زندگی گزار چکا ہوں۔ تمہیں دیکھتا ہوں تو جھرجھری آجاتی ہے"
اب کے قیدی کا قہقہہ ہلکا اور بے وزن تھا۔ سنتری کے اندر کچھ ٹوٹنے لگا' ٹوٹتا رہا' اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سمیٹا۔

یہ کیوں اس طرح موت کو گلے لگا رہا ہے۔ کہیں ایک لفظ بول کر نہیں دیا...... ابھی رقم کا بتا دے تو میں اس کے لئے کوئی ڈھنگ کا وکیل کر لوں...... لوگ تو ایک پھانس چبھنے پر پورے سات آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔"

ہر روز ڈیوٹی پر آتے ہی وہ ڈیوٹی انچارج سے پہلا سوال اس قیدی کے متعلق کرتا۔

"احکام آگئے ہیں؟"

نفی میں جواب سن کر وہ ڈوب سا جاتا...... پھر اپنے آپ کو سمجھاتا۔

"کسی کی موت کی تمنا نہیں کرنی چاہئے...... آخر میں سب ہی کو مرنا ہے"

اس کے باوجود قیدی کی موت کی تمنا اسکے دل کے میناروں پر چڑھ کر چاروں طرف جھانکتی پھرتی تھی۔

پھر ایک دن احکامات آہی گئے۔ سنتری نے ڈیوٹی انچارج کو ایک قیمتی کیک پیش کر کے اپنی ڈیوٹی لگوالی۔ پھسپھسی تاریکی کی چادر میں سایے رینگ رہے تھے۔ سورج کہیں بہت پیچھے تھا۔

وہ موت کی چکی سے نکلا۔ ڈاکٹر، مجسٹریٹ آگے بڑھے اور موت کی آخری رسمیں ادا کرنے لگے۔

سنتری نے اس تاریکی میں بھی اس کے چہرے پر ایک تاریک سایہ دیکھ لیا تھا۔

اچانک قیدی کی نظر اس پر پڑی اور اس نے اپنا مخصوص قہقہہ چھوڑ دیا۔

وہ قدم قدم قیدی کی طرف بڑھ رہا تھا...... پھر اس نے اپنا داہنا کان اس کے ہونٹوں سے چپکا دیا۔

اچانک اس کا کان سن ہو گیا اس کے اردگرد تاریکی میں دھندلے چہروں پر جھینپی مسکراہٹیں ابھر کر گم ہو گئیں۔

کان واپس لوٹ آیا

'حرام کا جنا پکا قاتل ہے۔ خونی ہے؟

قیدی نے اس کے کان میں ہونٹ اندر گھیڑ کر پوری آواز سے "ہاؤ" کر دیا تھا۔

وہ ابھی تک ہنس رہا تھا۔ قافلہ چل پڑا تھا۔ وہ بھی پیچھے پیچھے جنازے میں شریک ہو گیا۔

جب اس کی آنکھوں پر ٹوپی چڑھائی جا رہی تھی، سنتری کی آنکھیں اس پر جمی تھیں، شاید کوئی اشارہ......

'حرام کا جنا فضول میں لٹک گیا؟'

ایمبولینس ایک جھٹکے سے رک گئی......وہ ایک بار پھر گرتے گرتے بچا۔

ڈرائیور نے پلاسٹک کی منہ تک بھری ٹوکری اور تھرماس زمین پر رکھ دی تھی۔

پھر اس نے اس کی بیٹی کی مدد سے اسے سہارا دیکر نیچے اتارا۔

اس کا پرانا جھڑتا ہوا پیلے رنگ کا کوارٹر اپنی بھدی بانہیں پھیلائے اس کا منتظر تھا۔

اس نے تھوکنے کی کوشش کی لیکن تھوک دور گرنے کی بجائے اس کے سینے پر گر گئی۔

'حرام کا جنا اگر بتا جاتا تو......اب مجھے اسی پیلے بدبودار کوارٹر میں مرنا ہوگا! میں پھر جھوٹ بول گیا ہوں......میں بالکل، کبھی بھی نہیں مرنا چاہتا۔'

بے زبان

نیتے کے عین اوپر گھنے درخت کی چوٹی پر بیٹھی چیل اچانک پھڑ پھڑا کر اس بری طرح چلائی کہ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

آنکھیں کھلتے ہی سب سے پہلے اس نے مال کا جائزہ لیا .. رنگ برنگی گائیں بھینسیں زمین کا ہرا سینہ نوچ نوچ کھارہی تھیں۔

اس نے انگلیوں کی پوروں پر گنتی کی...... مال پورا تھا۔

بلبلاتی چیل نیلے آسمان میں دائرے کھینچ رہی تھی۔

اس نے پہلو میں لیٹی لاٹھی اٹھائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

سردیوں کی ڈھلتی دھوپ میں کیا نشہ ہوتا ہے...... ذرا ڈھیلے پڑے اور گئے۔

اس کی نظریں گھوم پھر کر بھوری پر جا جمیں۔

بھوری الگ الگ رہنے لگی ہے...... خیر خیریت سے بچہ دے دے تو اچھا ہے......

پچھلے سال مرتے مرتے بچی تھی۔ مردہ بچھڑے کو دیکھ کر زمیندار دنوں پھنکارتا رہا تھا۔

"نیتے یہ سب تیری حرامخوری کی وجہ سے ہوا ہے۔"

کیا میں بھوری کا دشمن ہوں؟ اس کے بچے کا برا چاہوں گا؟'

اس کا تالو تڑخیں مار رہا تھا...... وہ کپڑے جھاڑتا 'لاٹھی ٹیکتا چل پڑا۔

اسے عجیب سی سستی نے جکڑ رکھا تھا...... جی چاہ رہا تھا کہ بس ہاتھ پاؤں بکھیر کر پیٹ کے بل نرم نرم گیلی مٹی پر لیٹ جائے اور لیٹا رہے۔

'بھوری کے آخری دن ہیں...... صبر کے سوا چارہ نہیں...... اب کے کوئی گڑبڑ ہو گئی تو زمیندار زندہ......

درختوں کی اوٹ میں چھپے خانہ بدوشوں کے خیموں کی قطار نے اسکے چلتے ذہن کو جھٹکے سے روک دیا۔

'کل تو ادھر نہیں تھے! ہو سکتا میرے بعد آئے ہوں...... اوں...... مجھے کیا...... کوئی کب آیا کب جاتا ہے...... پانی پینا ہے...... اس سورج حرامخور کو بھی آج جلدی لگی ہوئی ہے۔'

شابا...... بھئی شابا...... یہ خانہ بدوش بھی عزت دار ہونے لگے۔

اس نے آواز لگائی۔

"کوئی ہے؟ ایک کٹورے پانی کا سوال ہے۔"

اس کے کان خیمے کے اندر تھے۔

ہلکا سا ارتعاش...... پھر کانچ کی چوڑیوں کا رقص۔

بھوری نے اچانک اس کے پیچھے آکر زوردار پھنکار ماری...... نیتا ٹھٹک کر اچھلا...... پھر ہنسنے لگا۔

بھوری بے زبان ہے...... لیکن ہے تو آخر کو عورت ہی۔

لڑکی نے ہاتھ لمبا کر کے اندر ہی سے کٹورا بڑھا دیا...... پھر منتظر وہیں رکی رہی۔

نیتے نے کٹورا منہ سے لگانے سے پہلے نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا...... وہ اپنے تازہ چھلے آلوچے ہونٹوں کو بری طرح چوس رہی تھی۔

نیتے نے ایک ہی سانس میں کٹورا خالی کر دیا۔

"بس یا اور ؟ صدیوں کے پیاسے لگتے ہو۔"

نیتے کا تالو جی اٹھا تھا اور اس کا پیٹ خوب بھر گیا تھا...... اس کے باوجود اس نے دوسرے کٹورے کا تقاضہ کر دیا۔

لڑکی نے پردے کو زور دار جھٹکا دیکر ایک طرف کر دیا...... اور کٹورا نیتے کے ہاتھ سے جھپٹ کر واپس اپنی کچھار میں چلی گئی...... اس کے ہونٹ نیتے کی رگ رگ میں اتر گئے تھے۔

نیتے نے دوسرا کٹورا بھی اندر انڈیل لیا...... پیٹ تن گیا تھا لیکن نیت نہ بھر پائی۔

لڑکی نے کٹورا لے لیا لیکن وہاں سے ہٹی نہیں۔

روز اس طرف آتے ہو؟"

نیتا زمین میں دھنسا جا رہا تھا...... اسکے منہ سے جواب کی بجائے سوال نکل گیا۔

"تم لوگ رات کو آئے تھے؟"

لڑکی نے ہونٹ کاٹے...... پھر بڑی بے رحمی سے چوسے...... مرنے سے پہلے وہ ایک اور نیزہ نیتے کے سینے میں اتار گئی۔

سورج بھاگتا ہوا سنہرے ٹیلوں کی اوٹ میں جا رہا تھا...... نیتا وہیں گڑا کھڑا تھا۔

اندر پھر چوڑیاں چھنکیں...... پھر ان سے زیادہ کھنکتی آواز آئی۔

"جلدی سے چلے جاؤ...... بابا آتا ہو گا۔"

نیتے کا دل بری طرح سے اچھلا...... پھر وہ پورے کا پورا شہد میں نہا گیا۔

"کل آؤنگا...... جب تک پیاس نہیں بجھے گی، آتا رہوں گا۔"

اندر چوڑیاں بلبلا اٹھیں...... انکی صدا پوری کائنات کو نگل گئی۔

سورج کو سنہری ٹیلوں نے ڈھانپ لیا تھا۔

گائے بھینسیں عادتاً ایک جگہ جمع ہو رہی تھیں۔

بھوری ایک تنومند درخت کے کھردرے تنے سے اپنے آپ کو ادھیڑ رہی تھی۔

نیتے نے اس کے قریب جاکر لاٹھی درخت پر جمائی...... پھر جمائی...... بھوری درخت کو چھیلتی رہی۔

نیتے نے پوری قوت سے لاٹھی اس کی کمر پر ماری...... بھوری چپ چاپ مال کی طرف چلدی۔

"دوسرا بچہ دینے کو ہے...... نخرہ نہیں جاکر دیا۔"

سانولی شام آنکھیں ملتی جانوروں کی گھنٹیوں کے ساتھ رقص کرتی اتر رہی تھی۔

مال کو وقت کا احساس تھا...... ان کے تنے ہوئے تھنوں میں دودھ کر لا رہا تھا......

سب ایک ساتھ قدموں کے پٹے راستے پر چلنے لگیں۔

وہ مال چھوڑ کر لوٹا تو...... جھونپڑی کو تاریکی مکمل طور پر نگل چکی تھی...... باہر جگنوؤں کا ڈھیر روشن تھا۔

لبا انتظار کرتے کرتے خود ہی حقے کی آگ بنا چکا تھا۔

نیتا وہیں اکڑوں بیٹھ گیا...... ابا کے زندہ ہاتھ سے چمٹا لیکر چلم میں دہکتے اپلے بھرنے لگا۔

لبا...... آج بہت دیر ہو گئی...... طبیعت کیسی ہے؟"

ہونٹ اور چمکتی چوڑیاں۔

لبا نے بڑی دقت سے پھڑکتے بدکتے لفظوں کو سنبھال کر باہر دھکیلا۔

"یہ روز روز میری طبیعت نہ پوچھا کر۔"

نیتے نے چلم سجائی...... خوب لمبے لمبے کش لگا کر حقہ گرمایا...... پھر ایک ہاتھ میں حقہ لے کر دوسرا ہاتھ لبا کی طرف بڑھایا...... لبا لنگ کر اٹھا اور اس کے ساتھ ساتھ گھسٹنے لگا۔

نیتے نے لبا کو چارپائی پر بٹھا کر حقے کی نے اسکے زندہ ہاتھ میں تھمادی۔

اس نے لبا کی جیب سے ماچس لے کر دیا جلایا...... کمرہ سرسوں کے تیل کی تیز بو سے بھرنے لگا۔

لبا سے اس کا رشتہ بڑا اجنبی سا رہا تھا...... کام کی بات اور بس...... کرنے کو زیادہ باتیں

ہوتی تھیں نہ موقع نصیب ہوتا تھا...... لیکن جب سے لبا پر فالج کا حملہ ہوا تھا اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس کے پاس بیٹھ کر بچپن سے لیکر اب تک کی ساری باتیں کر ڈالے...... عمر بھر کی جھجھک زبان نہ چھوڑتی تھی۔

لبا نے پھیپھڑوں کو گلا دینے والا کش لگایا...... اونگھتے انگارے لو دینے لگے۔

ہونٹ اور چمکتی چوڑیاں۔

اس کے منہ سے زندگی میں پہلی بار عرصے سے دفن سوال جھڑنے لگے۔

"اماں کب مری تھی؟ میری پیدائش سے پہلے یا بعد؟"

اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا اور وہ جھینپ گیا۔

لبا کے ایک طرف جھکے چہرے پر مسکراہٹ ابھری لیکن بوڑھی کھردری چھال میں گم ہو کر رہ گئی۔

"آج اس کی ضرورت کیوں آپڑی؟"

ایک اور سوال پھوٹ پڑا۔

"اماں کے مرنے کے بعد دوسری شادی کیوں نہ کرلی۔"

لبا نے حقے کی نے ایک طرف کردی اور گردن لمبی کر کے بیٹے کے چہرے کو ٹٹولنے لگا۔

"کیا دیکھ آئے ہو؟ میلے میں کوئی جن بھوت تو نہیں چمٹ گیا؟"

لبا نے اچانک گہری سنجیدگی اوڑھ لی۔

"تمہاری ماں بچپن میں ہی یتیم ہو گئی تھی...... اس کے ظالم چچا نے اسے تبرے واگی باپ کے گھر ڈال دیا...... اس کی موت کے بعد گاؤں کی کوئی لڑکی اس طرح یتیم نہ ہوئی۔"

اس نے حقے کی نے کھینچی اور ایک اور طویل کش لے کر ڈھیر سارا دھواں اگلا۔

"بھوری کا کیا حال ہے؟ مجھے تو اب کے بھی خطرہ لگ رہا ہے۔"

عنایتے کو غصہ آگیا۔

"بھوری گئی جہنم میں...... مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے...... ادھر بیلے میں خانہ بدوشوں نے خیمے لگائے ہیں۔"

لبا نے اپنا بوجھل جسم گھسیٹا اور قریب ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی...... لیکن عنایتے کا سر جھکا ہوا تھا۔

"ادھر ایک لڑکی ہے...... اس نے مجھے پانی پلایا تھا۔"

لبا نے ہنسنے کی کوشش کی...... اس کی ہنسی کھانسی میں الجھ کر نڈھال ہو گئی۔

"بھوری سے دل بھر گیا ہے؟ لڑکی لائے گا تو رکھے گا کہاں...... کھلائے پلائے گا کہاں سے؟ لڑکی لڑکی ہوتی ہے بھوری نہیں۔"

عنایئے کے نتھنے پھڑکنے لگے۔

لبا خود غرض ہو گیا ہے...... ہمیشہ سے تھا۔ آخر میری ماں کو بھی رکھا تھا۔ اسی جھونپڑی میں...... وہ کھاتی پیتی بھی ہو گی' میں بھی تو پیدا ہوا تھا۔

ہونٹ اور چھکتی چوڑیاں۔

لبا کے خرائے سناٹے کو زخمی کرنے لگے۔

عنایتے نے دیئے کو پھونک مار کر بجھا دیا...... اور دوسری چارپائی پر سمٹ کر لیٹ گیا۔

رات لمبی لیٹ گئی...... پل سرک کرنہ دے رہے تھے...... صبح بہت دور تھی۔

صبح اسے جاگنا نہ پڑا...... وہ سویا ہی کب تھا۔

وہ بھاگم بھاگ زمیندار کی حویلی پہنچا...... مال کھولا اور قدموں تلے روندے راستے پر ڈال دیا۔

مال پیچھے رہ گیا...... وہ خاصا آگے نکل گیا...... مال خود ہی پہنچ جائیگا۔

وہ دوڑتا ہوا درختوں کے جھنڈ کی طرف لپکا۔

وہاں کچھ نہ تھا' کچھ بھی نہ تھا' باسی روٹی کا ایک آدھ کچا کنارا...... انسانی غلاظت کے سوکھتے ڈھیر اور...... ایک ٹوٹا ہوا مٹی کا کٹورا۔

اس کے گھٹنے پانی ہو گئے اور وہ وہیں بیٹھ گیا۔

ہونٹ مر گئے...... چوڑیاں ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گئیں۔

"کوئی کب آیا ہے...... کب جاتا ہے...... مجھے کیا۔"

وہ لاٹھی کا سہارا لیکر اٹھا...... سورج خاصا اوپر چڑھ آیا تھا......

اس نے مڑ کر دیکھا...... بھوری اپنی لمبی زبان اس کی گردن کی طرف بڑھا رہی تھی...... اس نے دونوں بازو بھوری کی گردن میں ڈال دیئے۔

○

بھیڑیں

میں خیمے میں بالکل تنہا تھا۔

لبا اماں غائب تھے...... وہ اس وقت کسی دھکم پیل قطار میں گرتے پڑتے ہزاروں آنکھوں کے ساتھ گرم افق کی بانجھ ریت چھان رہے ہونگے۔

صحرا میں کہیں ہلکا سا ارتعاش...... کوئی سایہ، حرکت...... پھر تھکی تھکی، مسلسل چیونٹی کی مانند رینگتی گاڑی......

آگ کے شرابی بگولے لڑکھڑانے لگے...... خیمے کی دیواریں سانپ کے پھن کی طرح ہلنے لگیں۔

میں ڈر کر باہر نکل آیا۔

ہر سو گاڑھے، بدبودار کیچڑ کے پٹ پٹاتے بلبلے...... ایسے بہت سارے بلبلے میرے جسم پر بھی موجود ہیں...... ہر وقت جلن اور گرم کھجلی سے بلبلاتے رہتے ہیں۔

میں خیمہ نہیں چھوڑ سکتا...... چاروں طرف دنیا میں چور ڈاکو رہتے ہیں۔ ابھی کچھ

دن پہلے ہمارا پلاسٹک کا لوٹا چوری ہو گیا تھا...... اور پھر ہمارے خیمے میں ایک پرانا صندوق بھی ہے۔ ابا اس بھاری بوجھ کو اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے...... کئی دفعہ اس صندوق کی وجہ سے ہم قافلے سے پیچھے رہ گئے تھے...... خدا جانے اس صندوق میں کون سا خزانہ ہے جس کے لئے ابا اپنے ساتھ ہماری زندگی بھی داؤ پر لگائے بیٹھے ہیں۔

میرے پیٹ میں بھوک غصے سے پاؤں پٹخ رہی ہے۔ میں اکڑوں بیٹھ جاتا ہوں اور کبھی کھنچ کر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہوں...... کھانا ابا اماں کے آنے پر ملتا ہے اور ابا اماں......

اچانک موڑ پر کچھ ترتراہٹ سی ہوئی......

گاڑیاں...... راشن......"

پھر مجھے ہنسی آئی اور میرے آنسو نکل پڑے۔

دیکھنے میں بھیڑ کا بچہ لگتا تھا...... مرے مرے اکتائے انداز میں خیموں کی آہنی کھونٹیاں سونگھ رہا تھا۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگا...... پھر میرے بالکل قریب آکر رک گیا اور بلا تکلف میری بدبودار بجیان کا دامن منہ میں لیکر چبانے لگا۔

میں نے جھٹکے سے اپنا آپ چھڑایا...... میمنہ لڑھک کر ایک طرف ڈھ گیا...... اس نے اٹھنے کی کوشش نہ کی۔

یہ تو مجھے کھا جاتا!

میمنہ اطمینان سے گھوم پھر رہا ہے اور زندہ ہے...... کسی کی نظر نہ پڑی ہوگی۔

میں نے اسے سہارا دیکر اٹھایا...... پھر تقریباً گھسیٹتا ہوا اسے خیمے کے اندر لے آیا۔

اس کی آنکھوں کی رطوبت سوکھ گئی تھی اور اس کے بال جگہ جگہ سے جھڑنے لگے تھے۔

مجھے بالکل ہنسی نہ آئی۔

جانور بھی گنجے ہوتے ہیں!

میں نے کبھی کوئی گنجا جانور پہلے نہ دیکھا تھا۔

میمنہ ایک بے ڈھنگی ڈھیری کی صورت ریت کے فرش پر پڑا تھا...... یہ ساری کی ساری ریت ہمارے حصے میں کیوں ڈال گئی ہے...... کہیں کوئی......

میمنہ بے چارہ بھوکا تھا...... لیکن کہیں گھاس کا سوکھا مرا تنکا تک نہیں...... میں اسے کیا کھلاؤں!

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا دوسرے کونے کی طرف آیا...... وہاں ابا کا صندوق رکھا تھا...... صندوق کی لکڑی پرانے مردے کی طرح بدرنگ اور جگہ جگہ سے تڑخ گئی تھی۔

میں نے کنڈی ہٹائی اور ڈھکنا اٹھا دیا۔

بدبو کے تیز بھبکے نے میری ناک نوچ لی...... میں پیچھے ہٹ گیا۔

ایک بار پھر ہمت کر کے میں نے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔

صندوق چھوٹی بڑی بوسیدہ، جھڑتی ہڈیوں سے بھرا پڑا تھا۔

مجھے ایک دم سے غصہ آ گیا۔

ابا...... ہڈیاں...... یہ ہڈیاں اتنی بیکار ہو چکی ہیں کہ اگر پانی مل بھی جائے تو انہیں ابال کر پینا مشکل ہو گا۔

اماں مسکراتی ہوئی اچانک فضا سے اتری اور میرے برابر آ کھڑی ہوئی۔

اماں نے مجھے منہ میں انگلی دبائے دیکھا تو اپنی انگلی بھی دانتوں میں لے لی...... پھر اس نے خالی ہاتھ سے کھینچ کر انگلی باہر نکال لی۔

ممتا نے جست لگائی اور اماں نے مجھے اپنے سوکھے چڑ اسینے میں سمیٹ لیا۔

اماں کے سینے سے لگتے ہی مجھے بکری کا بچہ یاد آ گیا...... میں نے ادھر اشارہ کیا۔

"اماں...... وہ......"

اماں نے مجھے الگ کر دیا...... پھر خیمے کے چاروں خالی کونوں کا جائزہ لیا...... اس نے ٹھنڈی آہ سے ساری دنیا کو جھلس ڈالا۔

"میرے بچے...... اب بڑا ہو جا...... خواب دیکھنا چھوڑ دے۔"

اس کا چہرہ دکھ کی کھردری جھاڑیوں کا جنگل تھا۔

"بھیڑ کے بچے کو بھگادے..... جانور ہے..... کہیں نہ کہیں منہ مار کر پیٹ بھر لے گا۔"

اماں کھڑے کھڑے گرم ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

میمنہ بالکل بے سدھ پڑا تھا..... اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔

'میں اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا!'

میں نے خوب بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں۔

میں جب بھوکا ہوتا ہوں تو آنکھیں بھینچ لیتا ہوں اور چہرہ سورج کی آنکھ کے سامنے کر دیتا ہوں۔

مختلف رنگ..... گھٹتے بڑھتے، سمٹتے پھیلتے، اچھلتے کودتے آنکھ مچولی کھیلنے لگتے ہیں..... بڑا مزہ آتا ہے..... میں بھی ان کے ساتھ کھیل میں شامل ہو جاتا ہوں۔

پھر جب خالی معدہ ان رنگوں پر غرانے لگتا ہے تو میں رنگوں کی دنیا سے چھلانگیں لگاتا ہوا بھاگ نکلتا ہوں اور..... میرے لئے ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے..... میں جلد از جلد اپنے جزیرے پر پہنچ جاؤں۔

میرے جزیرے پر "ہوتو" ہیں نہ ٹٹسی..... کوئی مارنے والا ہے نہ مرنے والا..... بندوقیں نہ تیز دھار چھرے..... یہاں میرے سوا کوئی نہیں ہوتا۔

جزیرے پر شمال سے جنوب تک لمبا دستر خوان بچھا رہتا ہے..... اس پر گرم خوشبوئیں لٹاتے، نہ ختم ہونے والے پکوانوں کے ڈھیر لگے رہتے ہیں..... یہاں یو' این' او کی گاڑیوں کا انتظار نہیں کرنا پڑتا.....

میں دوڑ دوڑ کر ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر کھانا خوب ٹھونس، ٹھونس کر کھاتا ہوں..... اور پھر نڈھال، بے سدھ، وہیں نرم گھاس پر گر جاتا ہوں۔

اب جزیرے کی دوسری خوبصورت چیزیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔

سوئی سوئی، پر سکون لہریں انگڑائیاں لیتی آتی ہیں اور کچھ دیر ناریل کے لمبے تنوں کی بانہوں میں پھیل کر لیٹ رہتی ہیں..... پھر انہیں الوداعی بوسے دیتی ہوئی واپس سمندر کو

لوٹ جاتی ہیں۔

پکے ناریل ٹپ ٹپ گر رہے ہیں...... ہر طرف ان کے ڈھیر لگے ہیں اور کوئی کھانے والا نہیں ہے۔

میں اپنی خالی سستی پٹخ کر اٹھ بیٹھتا ہوں اور ناریل بوریوں میں بھرنے لگتا ہوں...... میں یہ بوریاں ہوتو اور ٹٹسی دونوں کے گھروں میں لے جاؤنگا...... دونوں بھوکے ہیں۔

ناریل بھی کیا پھل ہے! کھانا اور پانی ایک ساتھ!

ساری بوریاں ایک ساتھ پیٹھ پر لدنے کی مشقت میں جسم کے مسام پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں۔

جوں ہی بوریاں سب گھروں میں پہنچ جاتی ہیں تو میرا خالی معدہ پھر باؤلے کتے کی طرح بے ہنگم آواز میں بھونکنے لگتا ہے...... لحہ لحہ مرنے سے ایک بار مر جانا کتنا اچھا ہے۔

میرے لئے وہی آتشیں خیمہ ہے...... دھوپ ڈھلنے لگی ہے لیکن تپش میں کمی نہیں ہو رہی۔

میمنے نے اپنا سر بھوک کے آستان پر ڈال دیا ہے...... میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے جسم پر پھیرنا چاہا لیکن میرا ہاتھ بڑھ کر نہ دیا...... مجھے بڑی حیرانی ہوئی...... میرے اندر کوئی چور ہے!

ذہن پھر امیدوں کے گدلے پانیوں میں ڈوبنے ابھرنے لگا۔

شاید آج گاڑیاں آجائیں۔

میری آنکھیں بار بار خیموں کی لمبی گلی سے ہوتی ہوئیں بانجھ صحرا میں بھٹک کر واپس لوٹ آتی ہیں' میری آنکھیں پھوٹ کیوں نہیں جاتیں؟

میمنے کی گردن لڑھک گئی ہے......اس کے سینگ کیچڑ میں دھنس گئے ہیں۔

میں لرز اٹھا۔

فضا میں لبا کے گھسٹتے جوتوں کی آواز سرسرانے لگی ہے...... میں لبا کے جوتوں کی

آواز میلوں دور سے پہچان لیتا ہوں...... اور یہ بھی جان لیتا ہوں کہ اس کے ہاتھ خالی ہیں یا بھرے ہوئے۔

ابا کے ہاتھ خالی تھے...... گاڑی آج بھی کسی جگہ روک دی گئی ہوگی۔

ابا کی نظر سیدھی میمنے پر پڑی...... وہ اچھلا اور جلدی سے میمنے کے پیٹ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس کی آنکھوں میں روشنی لوٹ آئی۔

"زندہ ہے۔"

ابا میری طرف متوجہ ہوا۔

تم میری اولاد ہو...... مجھے تمہیں کوئی کچھ نہ کچھ کھانے کو دینا ہے...... تمہیں جب تک ممکن ہے زندہ رکھنا ہے۔ جا جلدی سے صندوق میں سے چھری نکال۔

میں نے ابا کو گھورا۔

"صندوق میں صرف ہڈیاں ہیں۔"

ابا کے چہرے پر عجیب و غریب مسکراہٹ ابھری۔

"اچھا کیا تم نے صندوق کھول کر دیکھ لیا...... ہڈیوں کے ساتھ چھری بھی ہوگی...... جلدی کرو۔"

میں نے اٹھنے کی کوشش کی...... میرے پاؤں ہل کر نہ دیئے...... کیا میں بھوک سے مرنا چاہتا ہوں!

اماں نے مشکل آسان کر دی...... وہ گرم ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی آئی اور ہمارے درمیان آکھڑی ہوئی۔

اس کے ہاتھ میں لمبی زنگ آلود چھری تھی۔

ابا نے چھری چھینی اور قریب بڑے پتھر پر زور زور سے رگڑنے لگا۔

میرے اندر ایک زخمی چیخ سسکنے لگی۔

کیا یہ ضروری ہے؟

لبا نے بے سدھ میمنے کو پلٹا اور اس کی گردن پر چھری چلا دی۔

میں خون کی لمبی، اچھلتی دھار کا منتظر تھا...... میمنے کے تڑپنے کا منظر......

کچھ بھی نہ ہوا...... میمنہ یوں ختم ہو گیا جیسے موم کا کھلونا تھا۔

لبا نے منٹوں میں میمنے کی کھال اتار کر الگ کر دی...... عجیب ٹھٹھرا ہوا، زردی مائل گوشت تھا۔

اچانک پوری خیمہ بستی میں زلزلہ آ گیا۔

"بھاگو...... بھاگو...... آ گئے...... آ گئے۔"

جانوروں کی طرح دوڑتے قدموں کی آوازیں...... خوف میں بری طرح لتھڑی انسانی آوازیں۔

لبا تھا نہ اماں...... صرف میں تھا...... اکیلا......

"میمنہ کہاں چلا گیا؟"

میں باہر کو لپکا...... پھر اچانک صندوق کا خیال آ گیا...... میں رکا۔

"بھاگو...... بھاگو...... آ گئے آ گئے"

آوازیں خیمے سے دور ہو رہی تھیں۔

میں نے دوڑ لگا دی اور سرپٹ دوڑتا ہوا بھاگتے ہجوم کے ساتھ پوری جان لگا کر دوڑنے لگا۔

سایہ

میں آرام کرسی پر ٹوٹا بکھرا ابھاری بھر کم کتاب میں دم دبائے' اندر ہی اندر چیاؤں چیاؤں کر رہا تھا۔

وہ بچپن کے والہانہ پن پر تتلی کی طرح تھرکتی آئی اور اپنی پھول برساتی پھلجڑی عین میری ناک کے نیچے جھونک دی۔

کرسی گرتے گرتے بچی اور کتاب زرد رد گھاس پر اوندھے منہ جا گری۔

میرے اندر دم گھٹی نفرت نے پھنکار ماری۔ میرے چہرہ بگڑو کی مزید بد صورت ہو گیا۔

نگین کے اندر جھلملاتے دیئے چھپاکے سے بجھ گئے۔

اس کی پھلجڑی ختم ہو چکی تھی اور وہ بوڑھے' سوچ میں الجھے قدموں واپس جا رہی تھی۔

کاش میں اتنا مضبوط ہوتا کہ اس چڑیل کا گلہ دبا کر اپنے اوپر مسلط مسلسل عذاب

سے نجات پا سکتا۔

کتاب ابھی تک منہ بسورے میرے قدموں میں پڑی تھی۔

میں نے چاہا کہ اسے اٹھالوں اور اپنی نفرت لفظوں میں ڈبو دوں ...... لیکن میری کمر مڑی نہ ہاتھ بڑھے۔

پھیلتا کلیجہ پھٹنے کو تھا...... میں نے گہرائیوں میں گلتی سڑتی نفرت اور کھولتے کرب کو راستہ دینے کے لئے ایک بھیانک چیخ ماری لیکن میرے سر کے اوپر یوکلپٹس کے درخت پر کائیں کائیں بولتا کوا بغیر اڑتے بولتا رہا۔

میں دندناتا ہوا اٹھا اور کچن میں جا پہنچا۔

نزہت اپنے آپ میں لت پت کھانا بنا رہی تھی

"اپنے آپ اور اپنی چہیتی بیٹی سے باہر نکل کر بھی دیکھ لیا کرو...... چائے کے کپ میں پوری شوگر مل ڈال دی تھی مجھے ڈائی بٹیک بنانے کا ارادہ ہے؟"

چائے صبح سات بجے پی تھی اور اس وقت بارہ بجنے کو تھے...... مجھے کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔

نزہت کی پتلیوں کی سیاہی اور گہری ہو گئی۔

"سوری...... آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔"

نفرت کا دم پھر گھٹنے لگا۔

"یہ عورت اتنی مٹی کی گڑیا کیوں ہے؟ کچھ بول کر دے تو آگے بڑھنے کا جواز بنے۔"

میں باہر آگیا...... لان میں یوکلپٹس کے درخت کے نیچے اکلوتی کرسی دامن جھاڑتی میری منتظر تھی...... میں نے اسی پر بیٹھ کر اپنی جنگ لڑنے کی ٹھان لی۔

تمہارا نام شاہد ہے' پیراند تایا کوڈل بھی ہو سکتا تھا...... تم تعلیم یافتہ ہو' یونیورسٹی میں پروفیسر ہو...... کم از کم دیکھنے والے تمہیں مہذب سمجھتے ہیں...... نزہت سے شادی تم نے خود' اصرار کر کے کی تھی۔ چیئرمین نے تمہیں اچھی طرح سوچنے سمجھنے کا موقع دیا تھا...... خود

نزہت نے...... اس کی چچی اس وقت بھی موجود تھی...... تم اسے شہر بھر میں لیئے لیئے پھرتے تھے...... نزہت نے تمہیں آخری بار سمجھانے کی کوشش کی تھی' تو تم کتنے برہم ہوئے تھے۔

"مرد صرف اور صرف اپنے بچوں سے محبت کر سکتا ہے۔"

"میں وحشی صدیوں کا مرد نہیں ہوں...... میں اکیسویں صدی کا کھلا ذہن ہوں۔"

وہ کھلا ذہن اندھا ہو کر چنگیز خان بن گیا ہے۔

اس تازیانے سے نفرت کی بری طرح الجھی گرہ ذرا سی ڈھیلی پڑی...... بس ڈھیلی پڑتی ہے' کھل کر' ختم ہو کر نہیں دیتی...... کاش یہ نفرت اور عذاب کا گھنا درخت کسی طرح سے سوکھ جائے اور میں اسے جلا کر اس کی راکھ دور گہرے سمندروں میں پھینک آؤں...... لیکن اس کی شاخوں پر ہر لحہ نئے شگوفے پھوٹ رہے ہیں۔

میں پھر کچن میں جا پہنچا......

"سوری...... نزہت میں بس میں نہیں رہتا...... سب کچھ چھوڑ دو۔ نگین کو تیار کرو' لمبی ڈرائیو پر چلتے ہیں' دوپہر کا کھانا بھی باہر کھائیں گے۔"

بہت دور سمٹتی دھند کے پیچھے سائے ناچ رہے ہیں۔

چیئر مین اپنی شادی کی سالگرہ کی دعوت دے گیا تھا۔

بوڑھے جوڑوں کو شادی کی سالگرہ منانے کا بڑا شوق ہوتا ہے...... وہ دوسروں کے ساتھ اپنے آپ کو بھی دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں کہ ان کی شادی کامیاب ہے۔

نزہت وہیں نظر آئی تھی۔

میں بچپن ہی سے کتابوں کے سمندر میں ڈوبا رہا تھا...... آج اچانک اس سمندر نے مجھے زوردار دھکا رے کر اوپر آسمان کی طرف اچھال دیا...... میں حیرت اور دلچسپی سے اس نئی دنیا کو دیکھ رہا تھا۔

میں خود بخود اسکے پاس جا بیٹھا...... اپنا تعارف کرایا اور بہت ساری بے کار اور بے معنی باتیں کرتا ہی چلا گیا...... کئی بار اپنے آپ کو روکنے کی کوشش کی...... طغیانی پر آیا دریا بند مان کر نہ دے رہا تھا۔

لمبے بال بچپن سے میری سائیکی کا حصہ تھے...... امی سردیوں کی میٹھی دھوپ میں اپنے بالوں کی آبشار سکھا رہی ہوتی تھیں تو پاگل ہونے لگتا تھا...... جی چاہتا تھا کہ اس آبشار میں اتر جاؤں اور گم ہو جاؤں۔

نزہت کے بال نیاگرہ کی آبشار تھے۔

زندگی کی پہلی کروٹ دار رات کی صبح کی...... کتابوں کے صفحات پر حروف کی بجائے ایک چہرہ تھا۔

'وہ اتنی ڈری ڈری' سہمی سہمی کیوں ہے؟ خوفزدہ کلی جسکا بس ذرا سا منہ کھلا ہو اور وہیں سب کچھ ٹھہر گیا ہو۔'

دوسرے دن میرے پاؤں مجھے چیئرمین کے کمرے میں لے گئے۔

"نزہت کو زندگی نے اچانک ڈسا تھا...... اس کا شوہر ایک ہوائی حادثے کی نذر ہو گیا تھا...... اچھی لڑکی ہے۔ بہت چاہتی تھی اسے۔"

میرے اندر بہت کچھ تھرتھرایا...... چیئرمین نے میری بدلتی رنگت محسوس کرلی۔

"محبت کتنی گہری اور شدید ہو' اب جیکٹ سامنے سے ہٹ جائے تو زیادہ دیر نہیں چلتی...... اس لئے کہ محبت بھی دوسری ضروریات کی طرح ایک ضرورت ہے...... جوان جذبات پر کچھ عرصے کے لئے راکھ ضرور جم جاتی ہے...... لیکن پھر زندگی اس راکھ کو پھونکیں مار مار کر اڑانے لگتی ہے...... پیچھے سے شریر خواہش موتیوں جیسے دانت نکال کر مسکراتی ہے' قہقہے لگانے لگتی ہے۔"

میرے بھٹکتے ذہن نے سر تسلیم خم کر دیا۔

شادی کے بعد نازل ہونے والے عذابوں کا دور دور تک نشان نہ تھا...... میں نئے سمندر میں اتر گیا۔

زندگی شراب کی گہری جھیل میں گزرنے لگی۔

نشہ ذرا سا ہلکا پڑتا تو دور ساحل پر ایک دھندلا سایہ آکھڑا ہوتا...... پھر آہستہ آہستہ'

وقت کے ساتھ ساتھ یہ سایہ واضع ہونے لگا...... ایک دن چلتا ہوا عین میرے سامنے آکھڑا ہوا...... یہ نزہت کا پہلا شوہر تھا۔

میرا ذہن تصویریں بنانے لگا...... ان میں رنگ بھرنے لگا۔

نزہت بالکل ایسے ہی بے لباس' بے خود اس کے ساتھ ہوتی تھی...... ان آنکھوں سے محبت بھر بھر اسے نہلاتی ہوگی......

میں اچانک بھری بہار میں اجڑ کر اٹھ آیا اور رات ڈرائنگ روم میں صوفوں کے کشن ملتے گزار دی۔

نزہت نے کبھی اپنے پہلے شوہر کی بات نہ کی...... میرے تجسس کا بے لگام گھوڑا جتیں لگاتا اس کی طرف بڑھتا تو وہ بات پلٹ دیتی...... میرے اندر کھولتا لاوا رسیاں تڑوانے لگتا۔

وہ صرف ایک بار اپنی عادت کے خلاف تنک کر بولی تھی۔

"وہ دور ختم ہو گیا...... میرے لئے اب وہ کبھی تھا ہی نہیں...... کیا آپ کوئی کمی محسوس کرتے ہیں؟"

کبھی کبھی تجسس کا پرندہ نڈھال ہو کر دم توڑ دیتا...... وہ کچھ دن مردہ پڑا رہتا اور میں بیڈ روم میں لوٹ آتا...... پھر وہ اچانک ہلتا' پھڑ پھڑاتا اور عین میرے دل پر آبیٹھتا...... اس کی تیز چونچ مجھے ادھیڑنے لگتی۔

اب میں ایک عرصے سے صرف اور صرف ڈرائینگ روم کا ہو کر رہ گیا ہوں۔

خوبصورت راتیں اور پھول دن اجڑ گئے ہیں۔ نزہت واپس اپنے اندر لوٹ گئی ہے اور بند ہو گئی ہے۔

نزہت لان میں پودوں کی کانٹ چھانٹ کر رہی تھی...... میری آج پھر چھٹی تھی اور میں گھر پر تھا۔

میں اسکے قریب آکر رک گیا...... قینچی ٹھٹھک گئی۔

میری آواز میں شہد بھرا تھا اور شہد کے پیچھے ہزاروں ڈنگ دار مکھیاں بھنبھنا رہی

تھیں۔

"میری ایک تجویز ہے برا نہ ماننا۔"

ادھر برا ماننے کو رکھا ہی کیا تھا...... ایک بار کھونٹے سے کھلی عورت کہیں بھی، کسی بھی جگہ پیروں کے نیچے زمین مانگتی ہے اور بس۔

"نگین کو میکے چھوڑ کر دیکھو...... شاید ہم اس جنگل سے باہر نکل آئیں۔"

میں لان میں اپنی کرسی پر نیم دراز تھا...... سورج گھرے بادلوں کے پیچھے سے جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا...... آج میرے ہاتھوں میں کوئی کتاب بھی نہ تھی۔

نزہت لوٹ آئی تھی۔ اس نے میرے کندھے پر کپکپاتا ہاتھ رکھ دیا۔

"میں نگین کو چھوڑ آئی ہوں۔"

"تم مجھ سے ناراض تو نہیں؟"

اس کی آنکھوں میں شبنم میں بھیگے جگنو تھے۔ اس کی زبان گنگ تھی۔

نزہت شعلوں میں گھرے بچے کو باہر نہیں نکال سکتی تھی۔ اسے صرف تھپک سکتی تھی...... تھپکتی رہی۔

میں نے کئی دن بیڈ روم میں کاٹے...... پھر میرے اندر کا جن مجھے ہنٹر مارتا ہوا واپس ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

'میں سلگ رہا ہوں...... تم پگھل رہی ہو...... کوئی حل؟"

دوسرے دن میں نے نزہت کو بھی میکے بھجوا دیا۔

پھر میں خالی کمروں میں بے رحم تنہائی کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ٹہلنے لگا...... بیڈ روم کی چیختی آوازیں دم بھر کو میرے پاؤں پکڑ لیتیں...... لیکن میں انہیں جھٹک کر آگے بڑھ جاتا......

میں جب بھی واپس لوٹنے کا سوچتا' نزہت کا پہلا شوہر چپکے سے گیٹ کھول کر' مجھ سے پہلے بیڈ روم میں بستر پر جا لیٹتا۔

نزہت' نگین اور میں...... تینوں باہر رہ جاتے۔

وقت بے چاپ چلتا رہا...... میرے سر کی اکلوتی سفید لٹ چڑھتے سفید سمندر میں ڈوبنے لگی۔

پھر ایک دن میرا اسد اکا روگی دل مجھے دھوکہ دے گیا۔

ایک ساتھ کئی نوکیلے تیز بھالوں نے ڈسا...... پھر گرم گرم بوجھل راکھ اندر ہی اندر گلانے لگی گلاتی رہی۔ نجانے کب مہربان بے خبری کو رحم آگیا اور وہ میرے سارے دکھ درد سمیٹ کر لے گئی...... میں تھا اور نہیں تھا۔

کبھی کبھی، بیچ بیچ میں پچھاڈین کی گہری چادر چھٹتی تو ایک دھندلا زرد چہرہ مسلسل کرسی پر بیٹھا نظر آتا۔

نزہت کو بڑھاپے نے بری طرح ڈسا تھا...... اس کی ویران بھٹکتی آنکھوں میں وحشتیں مستقل آبیٹھی تھیں۔

میں بچ گیا...... بار بار سوچتا تھا کیوں؟

اب میں ایک نازک، پر مسلی تتلی کی مانند تھا...... مجھے تیز ہوا سے بھی بچا کر رکھنا تھا۔

میں نے اپنے آپکو الٹ پلٹ کر اچھی طرح ٹٹولا...... میرے اندر پھنکاریں مارتا مرد خاموشی سے روپوش ہو گیا تھا۔

دو مہینے گزر گئے...... مجھے یونیورسٹی جانے کی اجازت مل گئی تھی۔

میں لان میں آیا تو نزہت میرے ساتھ تھی۔

یوکلپٹس کے درخت کے نیچے میری کرسی اوس میں بھیگی تھی اور اوپر ہمیشہ کائیں کائیں کرتا کوا بھی موجود نہ تھا۔

ایک طویل عرصے بعد میرے اندر جیتی جاگتی مسکراہٹ چمکی...... میں نے نزہت کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا...... ہاتھ وہاں اطمینان سے پڑا رہا۔

"میرے لئے آج کوئی چٹ پٹی چیز بنانا...... بدمزہ پھیکی چیزیں کھا کھا کر گھاس ہو گیا ہوں......"

میں کار کی طرف بڑھا...... میرے پاؤں رک گئے۔ میں نے پلٹ کر نزہت کی طرف دیکھا۔

وہ سرخ پھولوں سے چمکتی کیاری کے سامنے کھڑی تھی۔

"وہ...... میرے لوٹنے سے پہلے نگین کو ضرور لیتی آنا۔"

باہر سڑک سے میں نے اپنے گھر کا جائزہ لیا۔

بوگن ولا کی بیلیں پھولوں سے اٹی تھیں اور ان سفید پھولوں پر صبح کی نئی نئی دھوپ کھیل رہی تھی اور میرے گھر کے اندر کس بھیانک سایے کا وجود نہ تھا۔

گرتی سیڑھی

ایک بھٹکتی کرفت آواز نیند کے ریشمی گنبد کو مسلسل کھرچ رہی تھی۔

"کلو بیٹے...... اب اٹھ جا...... دیر سے جاگیں تو فرشتے دن بھر تھو تھو کرتے ہیں۔"

کلو نے آنکھیں کھولیں تو ان میں بکھرے سورج کے بھالے اتر گئے۔

"ہمارے چھت کی منڈیر نہ ہونے کے برابر ہے...... کس طرف سے کسی وقت بھی گولی......"

اماں کی آنکھوں میں لدی وحشتیں برسنے کو تھیں۔

کلو نے اپنے سینے پر زوردار ہاتھ مارا۔

"خواہ مخواہ پریشان نہ ہوا کر...... گولیوں والے تو ہم خود ہیں...... ہماری چھت بالکل محفوظ ہے۔"

کلو نے دھوپ کے رخ بیٹھی ماں کا جائزہ لیا...... تو ار نگت' سامنے کے اوپر والے دو

دانت ہوا میں معلق......بل بل ڈیل ڈول......

اسکی نگاہیں خود بخود اپنے سیاہ کھردرے ہاتھوں کی طرف لوٹ آئیں۔

اس نے شکایتاً آسمان کی طرف دیکھنا چاہا...... آسمان کو سورج نے ڈھانپ رکھا تھا۔

اماں اسے اذیت کے گہرے سمندر سے انگلی پکڑ کر باہر کھینچ لائی۔

"چل نیچے......زہرہ پراٹھے بنا رہی ہے۔"

اس انکشاف کے ساتھ دیسی گھی کی بو جھل خوشبو نے اسکے نتھنوں کو تھپتھپایا۔ پھر اچانک اسکی آنکھیں پھیل گئیں۔ ان میں پرانا سانپ سوال پھن تان کر آکھڑا ہوا۔

"ابا؟"

اماں کا چہرہ تلخی اور ہمدردی کے عجیب و غریب کیچڑ سے لت پت ہو گیا۔

"چلا گیا ہے۔ وہ بے چارہ تو ازل سے صبح منہ اندھیرے نکل جاتا ہے۔ تو اس پر کیوں غصہ کرتا ہے؟ وہ تجھ سے کیا مانگتا ہے؟"

ابا کی زبان پر، آنکھوں میں، جسم پر۔ ہر جگہ لوہے کے نوکیلے کانٹے ہیں۔ اسکی بھویں آسمان پر ہوتی ہیں۔ بات ہی ٹیڑھے منہ کرتا ہے۔

پھر اچانک اسکے اندر سے رحم کی ایک ہر اٹھی اور ہر شے کو نگل گئی۔

'ان بے چاروں کو زندگی نے کیا دیا ہے!۔ تھکا دینے والی مسلسل محنت اور اسکے نتیجے میں کبھی روٹی تک تو کھل کر میسر نہیں آئی۔'

لہر گزر گئی اور اپنے پیچھے زہریلا صحرا چھوڑ گئی۔

"خود کچھ نہیں کرتا تو دوسروں کو کیوں روکتا ہے؟"

اماں اپنی تنگ ذہن دنیا میں ٹھوکریں کھاتی کلو کے گیلے بالوں میں انگلیاں پھیرے جا رہی تھی۔

کلو کی آواز جھک گئی۔

"اماں۔ تو چل نیچے۔ میں آتا ہوں۔"

اماں تیزی سے اٹھی۔ سیڑھی پر نظر پڑتے ہی اسکی رفتار ڈھیلی پڑ گئی۔

کلو اسکی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ جھکی۔ سیڑھی کے دونوں 'منے' پکڑے۔ پھر الٹی ہو کر ایک ایک ڈنڈا اترنے لگی۔

"یہ سیڑھی بوسیدہ ہو چکی ہے۔۔ اسکی لکڑی دیمک نے چاٹ ڈالی ہے۔ کسی بھی وقت گر جائیگی اور نجانے اپنے ساتھ کس کس کو لے جائیگی۔"

کلو چیخا۔

"اماں کچھ بھی ہو جائے۔ ابا جان سے مارتا ہے، مار ڈالے۔ میں اس سیڑھی کو توڑ کر نیا زینہ ضرور بنواؤنگا۔"

محتاط کیڑے کی طرح سنبھل سنبھل کر اترتی اماں وہیں تھم گئیں۔

"نہیں کلو۔ تمہیں میرے دودھ کا واسطہ۔ تیرا باپ تمہیں، کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

کلو نے ابا اور اماں دونوں کو آگے پیچھے ایک ساتھ کھڑا کیا اور ایک ہی گولی سے اڑا دیا۔

'دونوں مر جائیں تو کیا فرق پڑے گا؟'

پھر اسکے اندر رہند' سلگتا لاوا پھوٹ کر بہہ نکلا۔

فرق تو پڑے گا۔ بہن بھائیوں کا تتر بتر' ننگے سر ننگے پاؤں جلوس قطار میں آجائیگا۔ انہیں زندگی کے بچے کھچے ٹکڑوں کی جگہ چپڑی روٹی ملنے لگی گے۔ اور۔ اور......'

کلو کا ماتھا چٹخنے لگا تھا۔

اس نے تکیے کے نیچے سے سیاہ سلگتی دھات کا پستول نکالا۔ اسے مقدس کتاب کی طرح بوسہ دیا۔ پھر چرخی گھما گھما کر سارے مسائل جھاڑنے لگا۔

وہ سیڑھی کے سرے پر رکا۔ اس پر حقارت سے نظر ڈالی۔ پھر اسکی نگاہیں لمبی تنگ گلی میں سفر کرتیں' باہر سڑک تک ہو آئیں۔

''بزدل مردوں کا شہر۔''

اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''لعنت ہے ایسی نامرد حکومت پر۔ اتنا تام جھام اور ذرا ذرا سی بات پر کرفیو لگا دیتی ہے۔'

ایک کمرے اور ایک برآمدے کی چھت کتنی بڑی ہو سکتی ہے!

لبا نے اگلے وقتوں کے بچے کھچے بلاکوں کی قطار کے پیچھے ریت کی ڈھیری سجا رکھی تھی۔

'پتا نہیں کون سا محل ہتانا ہے! ساری مصیبت لبا ہے۔ اپنے ریت کے بھر بھرے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے اتر آئے تو سب کی زندگی سہل ہو جائے۔۔پانی کا لبالب بھر گھڑا منہ کھولے پانی اچھال رہا ہو اور اسکے اردگرد جمع لوگ پیاسے مرتے رہیں!

'اچھے کپڑے دوستوں کے گھر اتار کر لبا کے دیئے کھردرے شلوار قمیض کی بوئیں سونگھتے گھر آؤ اور غریبی بچھا کر اللہ اللہ کرتے رہو۔ ایک اکبر کا باپ ہے۔ کیا خوشی خوشی گلشن والے بنگلے میں منتقل ہو گیا ہے۔

'لبا سے بات تو کر کے دیکھوں۔'

کلو کو جھرجھری آگئی۔

'مار مار کر کھال ادھیڑ دے گا۔ ایک کا مال نہیں۔ جب گرجتا ہے تو۔۔۔۔۔'

اس نے ریوالور تانا۔۔۔ سیفٹی کیچ ہٹایا اور ہوڑ کے پر انگلی جما کر نشانہ لیا۔ انگلی وہیں رکھی رکھی سن ہو گئی۔ لبا زمین سے آسمان تک تنا کھڑا تھا۔ اسکی آنکھوں سے حقارت کے میزائل چھوٹ رہے تھے۔

کلو الٹا ہو کر' احتیاط سے جھولتی' چوں چوں سیڑھی اترنے لگا۔

برآمدے میں زہرہ کے گرد ایک میلہ لگا تھا۔

'غنیمت ہے لبا سارا دن فیکٹری میں جتا رہتا ہے۔ پیچھے یہ لوگ کچھ ڈھنگ سے کھا پی لیتے ہیں۔'

وہ اچانک گھر کا مرد بن گیا۔

"اماں آٹے گھی کی کیا پوزیشن ہے؟ کسی کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔"

اماں نے گھی نچڑتے پراٹھے کا نوالہ حلق سے اتارا۔

"تیرے جیسے کماؤ پوت کے ہوتے ہوئے کسی چیز کی کمی ہو سکتی ہے بھلا۔"

ابا پھر کلو کے دماغ میں تیز چھری کی مانند گھوم گیا اور اسکی آنکھیں کرفتگی تھوکنے لگیں۔

اماں کے دبڑ دبڑ چلتے منہ پر پریشانی ہچکولے کھانے لگی۔

"دیکھو...... میں تیری ماں ہوں...... ایک بات سچ سچ بتا دے...... تو کوئی خطرے والا کام تو نہیں کرتا...... مجھے کبھی کبھی ہول اٹھنے لگتے ہیں۔"

کلو نے بڑی مشکل سے ابلتے غصہ پر بند باندھا۔

جانتی ہے، سمجھتی ہے اور کیسے بھولی بنی رہتی ہے۔

"اماں...... روٹی کمانے کہیں بھی جائیں، خطرہ ساتھ لگا رہتا ہے...... ابا کسی بھی وقت چلتی مشین میں آ سکتا ہے۔"

اماں مصلحتیں چھوڑ چھاڑ...... ایک دم سے بگڑ گئی۔

"حرام کے جنے کبھی کوئی اچھی بات بھی منہ سے نکال لیا کر۔"

اماں کی الجھن دیکھ کر کلو کی ہنسی چھوٹنے کو تھی لیکن اس نے سنجیدگی اوڑھے رکھی۔

"اماں...... آج تم بھی ایک بات سچ سچ بتا دو...... کیا ہمیں، تمہیں ابا کی ضرورت ہے؟"

اماں شرما کر بالکل ہی توا ہو گئی۔

"حرام کے جنے ماں سے بھی باز نہیں آتا...... کیسے ننگے سوال کرتا ہے!"

اب کلو اپنی ہنسی نہ روک پایا۔

وہ دو تر تراتے پراٹھے اتار چکا تھا...... اس نے ایک ساتھ ایک لمبی انگڑائی اور اتنی ہی لمبی جمائی لی اور اٹھ کر اندر بستروں سے لدی چارپائی پر جا پڑا۔

'امیر بستیوں میں گڑبڑ ہوتی ہے نہ کرفیو لگتا ہے۔ شامت چھوٹے لوگوں کی آتی ہے...... اکبر بھروسے کا آدمی ہے...... پر پیسے پر اور اتنی بڑی رقم پر ایمان کو غچہ کھاتے دیر لگتی ہے! اگر وہ مکر مکر اگیا تو...... پوری سات گولیاں اتار دونگا۔'

پراٹھے دماغ پر اثرانداز ہونے لگے تھے...... ذہن ہلکورے کھاتا خوابوں کے سفر پر چل نکلا تھا۔ سفید براق وردی میں اکڑا خانساماں...... ناشتے کی لمبی چوڑی میز...... باہر کلاشنکوف بردار مسلح، مستعد گارڈ اور دروازے سے لگی چم چم لمبی کار......

اچانک اڑتے خوابوں کو بے رحم ہاتھوں نے پیروں سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا...... کلو پھر ننگی خشک ریت پر ہانپتا چل رہا تھا۔

'اس دیانت کے پتلے کو دیکھو...... جان ہتھیلی پر سجا کر سنسان گلیوں اور بازاروں میں کبڑا چلتا صبح ہی صبح فیکٹری نکل گیا ہے...... راستے میں کہیں کوئی بے راہرو گولی اپنا کام کر گئی تو ساری دیانت ساتھ ہی دفن ہو جائیگی۔'

ذہن نے کروٹ بدلی اور پھر چل پڑا۔

'ابا کے سوئم پر ساری بستی اکٹھی کرونگا...... گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جگ مگ جگ مگ کرتی دیگوں کی قطار چڑھے گی...... اگر زندہ ڈھنگ سے نہ رہ سکا تو کم از کم موت ڈھنگ سے ہو گی۔'

وہ جھنجھلا اٹھا۔

'ابا...... ابا...... ابا...... مصیبت ہو کر رہ گیا ہے...... حلق سے اترتا ہے نہ تھوکا جاتا ہے۔ گھر میں مستقل بند رہنے سے اس کی بے چینی منہ زور ہوتی چلی جا رہی تھی۔

وہ دروازے کی طرف بڑھا تو اماں چلا اٹھی۔

"باہر نہ نکلنا...... ظالم دیکھتے ہی گولی مار دیتے ہیں۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

تنگ گلیوں تک کرفیو نہ پہنچ پایا تھا...... گلی میں پورے جوش و خروش سے کرکٹ چل رہی تھی۔

وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا رہا...... پھر رحمٰن ٹھیکیدار کے دروازے پر رک کر گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔

ٹھیکیدار نے اوپر گرل کے جھروکے میں سے جھانکا اور بھیکنے لگا۔

”آؤ...... کلو بادشاہ...... آؤ۔“

کلو کے سیاہ ابھرے ہونٹوں پر گالی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”حرامی نے کیسا رنگ بدلا ہے...... سب حرامیوں نے رنگ بدل لیا ہے...... کلو بادشاہ! حقیر کیڑا جان کر، منہ پھیر کر نکل جایا کرتا تھا۔“

کلو دندناتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

ٹھیکیدار پورا منہ کھولے اس کے استقبال کو کھڑا تھا۔

”ایک فون کرنا ہے۔“

”دس کرو...... کلو بادشاہ...... فون تمہارا ہے۔“

وہ اکبر سے بات کر رہا تھا...... پس منظر میں انڈین گانوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

عین اس کے پیچھے ٹھیکیدار کا بدلا ہوا چہرہ گھگھیایا کھڑا تھا۔

”کلو بادشاہ...... ایک جگہ رقم پھنس گئی ہے۔“

کلو نے کھٹاک سے ریسور واپس رکھا۔

”ٹھیکیدار...... پھنسی ہوئی رقمیں مفت نہیں تیرتیں...... سوچ سمجھ لو...... پھر بات کریں گے۔“

واپسی میں وہ کرکٹ کھیلنے لگا...... اس کی سوچوں کے سمندر سوکھ گئے اور وہ واپس ایک نارمل ٹین ایجر کی جون میں آ گیا۔

شام ابھی اترنے کو پھڑپھڑا رہی تھی...... اچانک مساجد سے کرفیو بریک کا اعلان ہونے لگا۔

بڑے، گھر کے قید خانوں کی سلاخیں پھلانگ کر روتی پیٹتی زندگی کی ضرورتیں

پوری کرنے بھاگ پڑے...... بچے سب چھوڑ چھاڑ تنگ بدبودار گلیوں کی گھٹن جھٹکنے بڑی سڑک کی طرف لپکے...... وکٹیں، بیٹ بال اپنی دلچسپی کھو بیٹھے۔

کلو پنواڑی کے کھوکھے پر لگے میلے میں شامل ہو گیا۔

گلوری منہ میں دبا کر اور گولڈ لیف کی سگریٹ سلگا کر کلو نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔

جلی ہوئی ڈھانچہ گاڑیاں، ادھ پگھلے دھواں چھوڑتے ٹائر...... ہر سائز کے پتھر......

کلو کو پکی سڑک اور شہر کی بے حرمتی اچھی لگی۔

اچانک اس کی پشت کی طرف والی تنگ گلیوں سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔

دوکانوں سے چمٹی پاگل چیونٹیاں ایک دوسرے کو دھکیلتی، کچلتی، اندھا دھند اپنے بلوں کی طرف بھاگنے لگیں...... آنسو گیس کی کاٹتی دھند میں چیختی دھاڑتی گولیاں اپنا کھیل کھیلنے لگیں۔

کلو جلدی سے گندے نالے کیساتھ لیٹ گیا...... اور سینے میں بلبلاتے پستول کو تھپکی دی۔

وہ گھسٹتا ہوا گلی کے موڑ تک آ پہنچا تھا...... اچانک اس کی نگاہیں پاگل سڑک پر ایک جگہ جم گئیں۔

"ابا...... اسے بھی اس وقت آنا تھا؟"

سڑک کی دوسری طرف سے ایک اور باڑ آئی...... ابا گر گیا۔

کلو اچھلا اور ریوالور نکال لیا...... ابا لڑکھڑا کر اٹھا اور لڑھکنے لگا۔

بھڑکتی گلیاں اچانک ٹھنڈی پڑ گئیں۔

کھوکھے سے چند قدم کے فاصلے پر ابا ایک بار پھر گرا۔

کلو اندھا دھند ابا کی طرف لپکا اور اسے سہارا دیکر تقریباً گھسیٹتا ہوا کھوکھے کے پیچھے لے آیا۔

کلو ابا کے خون میں لت پت ہو گیا۔

لبا کے چہرے پر مرجھاتی ہوئی زردی پھیل رہی تھی......

لبا کی آنکھیں کلو پر جمی تھیں...... پرانی درشتی اور قہر کا کہیں نام ونشان نہ تھا......

ایک سمندر تھا...... ساری کائنات پر محیط اور اس کے اوپر لازوال محبت کی سنہری گیلی دھند تھی۔

کلو کا سر خود بخود جھک گیا......اس کے ہونٹ لبا کے ماتھے سے لگ کر رینگنے لگے۔

لبا نے ایک ہلکی سی ہچکی لی......اور ختم ہو گیا

کلو لبا کو اٹھانے لگا تو ریوالور آڑے آیا......اس نے ایک نظر ریوالور پر ڈالی اور اسے پوری قوت سے گندے نالے کی طرف اچھال دیا۔

اب اس کے دونوں ہاتھ آزاد تھے......اس نے لبا کو اٹھا لیا۔

بیچارہ نوٹ

شیخ سلامت علی نے گلی کے ایک طرف ہو کر ناک خنخنائی، حلق جھنجھوڑا اور تڑاخ صاف ستھری دیوار کی جڑ میں تھوک مارا...... پھر سرخ اور سنہری جھلملاتی دھاریوں والے صافے سے داڑھی منہ رگڑتے ہوئے دور افق پر ایک سرسری نظر ڈالی۔

گدلے آسمان کے نرم پیٹ میں چبھتے اونچے اونچے پلازہ مٹیالی دھند کی اوٹ میں تھرک رہے تھے۔

صبح ہی صبح گرد کا یہ حال ہے!'

شیخ بڑی سڑک والا موڑ مڑنے کو تھا کہ ایک رکشہ بے سرا 'بھونکتا' دھواں اگلتا گزر گیا۔

'شہر اب شریفوں کے رہنے کے قابل نہیں رہا۔'

چوک میں کتوں کی بارات اتر آئی تھی۔ کچھ جیالے منہ پر تہہ در تہہ کرختگی پھیلائے، ننگے دانتوں ایک دوسرے پر غرا رہے تھے۔ شرفاء دمیں پیٹ تک اندر سمیٹے، پریشان

حال وضع داری قائم رکھے تھے۔ کم ظرف لینے میں نہ دینے میں۔ بس ادھر ادھر دوڑ بھاگ کر اپنے آپ کو منوانے میں مصروف تھے اور جنسی دیوانے اس بھیڑ بھاڑ میں بھی کھلے عام اپنی سی کوششیں جاری رکھے ہوئے تھے۔

ابھی صرف دودھ دہی اور انڈے ڈبل روٹی والی دکانیں کھلی تھیں۔ گنے چنے گاہک اور دکاندار کھلی بتیسیوں کے ساتھ اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

شیخ دھڑلے سے کتوں کے غول میں گھس گیا اور دھڑ دھڑا اپنی مضبوط، پتیل کی شام والی چھڑی برسانے لگا۔

بزدل پہلے ہی ہلے میں میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے' دو چار لفنگوں نے تھوتھنی اٹھا کر، بخ بخ سے شیخ کو ڈرانے کی کوشش کی، آخر میں انہیں بھی پسپا ہونا پڑا۔

شیخ نے فاتحانہ پہلے خالی چوک کا جائزہ لیا پھر چاروں طرف آنکھیں پھیرائیں۔ اس کا قد اونچے پلازوں سے بھی لمبا نکل گیا تھا۔

وہ قریب والے دوکاندار کی طرف بڑھا اور اسے چھڑی کے نیزے پر رکھ کر ڈانٹا۔

"کچھ خدا کا خوف کرو...... نجس مخلوق کو دیکھ دیکھ کر ان کی مکروہات سیکھ جاؤ گے ...... پہلے ہی کیا اچھا ہے! ہمت نہیں تھی تو دور سے پتھر مار کر بھگا دیا ہوتا۔"

دوکاندار کے ارد گرد کہیں چلو بھر پانی نہ تھا۔ وہ کاؤنٹر کا تختہ اٹھا کر دوکان میں گھس گیا۔

شیخ اس کے پیچھے چھڑی لہراتا لپکا۔

"سنو...... منہ کیوں چھپا رہے ہو؟ ایک درجن انڈے' ایک بڑی ڈبل روٹی...... انڈے بڑے بڑے نکالو' چن کر' کوئی ٹوٹا ہوا نہ ہو۔"

شیخ نے سامنے کی جیب سے دو تہی نوٹ نکال کر انگلیوں میں ملا' اس کی تازگی اور کرارے پن کو روح تک محسوس کیا' پھر ایک منی عذاب سے گزر کر دوکاندار کو دے دیا۔

"کاغذ کے ٹکڑے..... کہیں سے کبھی ایک ھنکتا روپیہ مل جاتا تھا تو پانچ کٹورے

بھنگ کا نشہ چڑھ جاتا تھا' محمد شاہ رنگیلا بنے پھرتے تھے 'اب یہ پچاس کا نوٹ ڈبل روٹی انڈوں میں گھل جائے گا...... نئی نسل نے کمانا کم اور اجاڑنا زیادہ سیکھا ہے۔"

دوکاندار کا سر ابھی تک بڑی دلیری سے منافق شرمساری کا بوجھ اٹھائے ہوا تھا۔

اس نے کیش والا دراز کھول کر نوٹ اندر پھینکا اور نیچے ہی نیچے ہاتھ چلا کر چھوٹے نوٹ اکھٹے کرتا چلا گیا۔ پھر سب جوڑ کر بقایا رقم شیخ کے لمبے 'پھیلے ہوئے ہاتھ میں دے دی۔

شیخ پلاسٹک کی منہ تک ٹھنسی تھیلی اٹھا کر پلٹا...... اس کے پاؤں ٹھٹھک کر زمین میں گڑ گئے۔

اس نے چہرہ پیچھے ہٹا کر' آنکھوں کا زاویہ بڑھا کر' ہاتھ میں پکڑے نوٹوں کو گھورا...... زمین نے اسے دھکا دیا اور وہ چار چھ قدم آگے بڑھ گیا۔

دیوار کی اوٹ میں ہو کر رقم گنی۔

"پچاس کا نوٹ لے کر اسی واپس کر رہا ہے۔ نجس کا دماغ ابھی تک کتوں کی آوارہ خرامیوں میں اٹکا ہوا ہے۔ چار چھ پیسے دوسروں سے اوپر ہی رکھتا ہے...... کم بھی تولتا ہو گا...... اس کی سزا...... یہ پچاس کا اضافی نوٹ کسی مستحق کو دے دیا جائے...... بھول ہوئی ہے' واپس کر دینا بہتر ہو گا۔"

شیخ نے واپس پلٹنا چاہا لیکن وہ کمر تک زمین میں گڑا تھا۔

'ممکن ہے بیگم نے پچاس کی بجائے سو کا نوٹ دیا ہو...... گھر سے نکلتے وقت ہر شے نورانی اجالے اندھیرے میں لپٹی تھی...... اوپر سے ان کا چشمہ تھانہ ہمارا...... باقی تو ہر طرف اللہ کا کرم ہے' آنکھوں پر بڑھاپا اتر آیا ہے...... واپس لوٹانے سے پہلے گھر چل کر پتا کر لیں۔'

اچانک شیخ رہا ہو گیا اور تیز تیز گھر کی طرف چل پڑا۔

ملک کا بٹوارہ ہو رہا تھا...... سرحدوں کے دونوں طرف ہنستے بستے شہروں نے تاریک جنگل اوڑھ لئے تھے۔ انسانوں کی واپس دمیں نکل آئی تھیں اور وہ چار ٹانگوں پر دوڑنے لگے تھے۔

بلوائی کرپانوں کی نوک پر بھگوان اچھالتے اچانک شیخ کی گلی میں آ گئے...... شیخ نے

جلدی سے تیار شدہ نقدی جوتوں میں اڑسی اور بکھے چھتوں پر دوڑتا پھلانگتا گلیوں' بازاروں میں مذہب کے خون آلود کیچڑ پر سے پھسلتا گرتا کیمپ پہنچ گیا۔

ٹرین واہگہ کے اسٹیشن پر رکی تو شیخ کو اپنی نابینا ماں یاد آئی...... اور وہ بلک بلک کر' خوب کھل کر رویا...... لاہور سے حیدر آباد اور کراچی ...... شیخ کو بند روڈ کے فٹ پاتھ پر اڈا جماتے دیر نہ لگی۔

'آدمی مرے یا جیئے' جوتے ضرور پہنتا ہے اور جوتے ادھڑتے' پھٹتے ضرور ہیں۔'

شیخ نے جب پرانے جوتوں کی مرمت کے ساتھ نئے جوتے بینے شروع کیے تو وہ سلامو موچی سے سلامت موچی ہو گیا۔ اور جب اس نے کھار اور میں اپنی رہائشی کوٹھڑی میں چار کاریگر بٹھا لیئے تو سلامت علی بن گیا...... اور اونچا اٹھا تو شیخ جی...... ان دنوں زمین کو آسمان اور آسمان کو زمین ہوتے دیر نہ لگتی تھی۔

فیکٹری کا کام دونوں لڑکوں نے سنبھال لیا تھا...... لیکن شیخ کو کسی پر بھروسہ کرنے کی مہلک بیماری کبھی نہ لگی...... وہ اب بھی صبح لڑکوں کے ساتھ فیکٹری جاتا اور رقم کا لین دین اور حساب مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں رکھتا۔

شیخ نے گھنٹی بجائی۔

گھر ابھی تک پوری طرح بیدار نہ ہوا تھا' بیگم کو خود ہی آنا پڑا۔

دور پچھلے کمروں سے بڑے پوتے کی مسلسل بے آنسو رونے کی آواز سوتی جاگتی نیند میں انگڑائیاں لیتے ماحول کو ٹھوکے دیئے جا رہی تھی۔

'یہ بدمعاش دن کا آغاز ہی روں روں سے کرتا ہے...... اس کے ماں باپ ڈاکٹروں کے پاس لیئے پھرتے ہیں...... سب چور ہیں...... مسجد سے تین دن دم کروا لائیں' سب ٹھیک ہو جائے گا...... کون سمجھائے ان لوگوں کو۔'

میز پر بیٹھ کر کھانا پینا شیخ کو کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کے برابر لگتا تھا' لیکن مجبوری تھی' اس نے اس کا حل نکال لیا تھا...... وہ ہمیشہ جوتا اتار کر دونوں پاؤں کرسی پر رکھ لیتا تھا۔

دو چار نوالے اتا کر شیخ نے بیگم سے پوچھ لیا۔

"صبح مجھے ناشتے کے لئے کتنے کا نوٹ دیا تھا؟"

"پچاس کا...... کیوں؟"

بیگم کے بڑھاپے میں لت پت چہرے پر حیرانیوں کی ٹکڑیاں ابھر آئیں۔

"چشمہ لگا کر دیکھا تھا؟"

صبح صبح چشمہ کون ڈھونڈتا پھرے...... لیکن تھا پچاس ہی کا' شام کو عابد سودا لایا تھا' اسی نے واپس کیا تھا' عابد سے پوچھ لوں؟"

شیخ نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور جیب سے دس دس کے تین نوٹ نکال کر بیگم کو پکڑا دیئے...... پچاس کا اضافی نوٹ اندر جیب میں پڑا رہنے دیا۔

ناشتے کے بعد شیخ اٹھا کہ نوٹ واپس دوکاندار کو لوٹا آئے تاکہ اسے اس خوامخواہ کی الجھن سے نجات ملے۔

وہ برآمدے تک صحیح سلامت پہنچ گیا...... لیکن پھر اسے اچانک یاد آیا کہ نمبر دو کاپی میں کل کے حساب کا اندراج باقی ہے...... کچھ بھول بھلا گیا تو دقت ہو گی۔

'جلدی کیا ہے اس کی امانت رکھی ہے' کوئی انکاری تھوڑا ہوں' ابھی نکلتے وقت دے دونگا۔'

وہ حساب کتاب میں ایسا غرق ہوا کہ باہر گاڑی کے بار بار ہارن دینے پر بڑی مشکل سے ابھرا۔

شیخ نے بستر پر رکھے کلف میں کڑکڑاتا سفید براق کرتہ شلوار پہنا اور نکل کھڑا ہوا۔

دو منٹ دیر ہو جائے تو یہ حرام خور مزدور طبقہ ہاتھ باندھ کر عیش کرنے لگتا ہے۔

کوئی تیسرے پہر اچانک اسے نوٹ کا خیال آیا۔ اس نے جلدی سے سامنے والی جیب میں ہاتھ مارا۔ پریشانی ابھی پیشانی کی طرف بڑھی ہی تھی اسے یاد آگیا۔ نوٹ تو نماز والے کرتے میں رہ گیا تھا۔

'دونوں بہوئیں ہر وقت صابن کی تباہی پر کمربستہ رہتی ہیں...... کرتہ دھو ڈالیں

گی...... اتنی عقل کہاں کہ جیب دیکھ لی جائے

پھر اسے کچھ اطمینان ہوا۔

'پہلے بھی کئی بار اس طرح نوٹ دھل چکے ہیں۔ گرم گرم استری پھیر لیں تو کیا نئے نکور نکل آتے ہیں۔ لوگوں کو رکھنے ہی نہیں آتے' شکل صورت بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔'

واپس لوٹے تو بتیاں روشن ہو چکی تھیں...... مغرب نکلے جا رہی تھی...... شیخ نے جلدی جلدی انہیں کپڑوں میں نماز پڑھ لی۔

دعا کیلئے ہاتھ اٹھے تو ساتھ ہی پچاس کا نوٹ چھلانگ لگا کر سامنے آبیٹھا۔ قائداعظم کی تصویر انگلی اٹھا کر کچھ کہہ رہی تھی۔ ہونٹ ہل رہے تھے' آواز گونگی تھی۔

شیخ لپک کر غسلخانے پہنچے۔

نماز والا کرتہ ویسے ہی لٹکا تھا اور نوٹ بھی جیب میں موجود تھا۔

شیخ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ امانت محفوظ ہے۔

'یہ کام ابھی اور اسی وقت ہو جانا چاہئے۔'

اس نے بیرونی گیٹ کھولا اور گھنٹی بجائی کہ کوئی دروازہ بند کر لے۔

اس کا صبح صبح بے آنسو رونے والا پوتا ہنستا ہوا آیا اور کنڈا لگا کر واپس بھاگ گیا۔

'بدمعاش اس وقت کیسا بھلا چنگا ہے...... صبح اٹھے گا تو پھر وہی روں روں...... ابھی واپس آ کر اسے دم کرانے لے جاتا ہوں...... اس کے ماں باپ......'

شیخ ابھی آدھے راستے میں تھا کہ اچانک ہوا کے ایک تیز جھونکے سے نوٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ شام کی سمندری ہوا نوٹ کو کئی قدم آگے لے گئی۔ شیخ نے جوان دوڑ لگا کر اسے چند جستوں میں جا دبوچا۔

نوٹ اٹھا کر اس نے آگے بڑھنا چاہا...... وہ گردن تک زمین میں دھنس گیا تھا۔

ذہن میں زلزلہ سا آیا' اوپر کی چیزیں نیچے اور نیچے کی اوپر تیر گئیں۔

'برسوں پہلے' وہیں بندر روڈ پر' جب چپلوں کا ٹھیلہ لگاتا تھا...... میرا سو کا نوٹ گر گیا تھا' رات بھر انگاروں پر لوٹتا تلاش کرتا رہا...... کس نے واپس کیا؟ اس وقت کا سو کا نوٹ ہزار

کے برابر تھا۔'

شیخ نے نوٹ کو جھاڑا پھر پورے اطمینان اور سکون سے اوپر کی جیب میں رکھ لیا۔
وہ واپس پلٹا تو بالکل آزاد تھا' زمین نے اسے چھوڑ دیا تھا۔

انگارہ

میں ایک درمیانے درجہ کا نان رشوت سرکاری ملازم ہوں۔

بزرگوں سے سنتے آئے تھے کہ رشوت خور کو دریا کی لہریں گننے پر لگا دیا جائے تو وہ وہاں بھی آمدنی کے ذرائع پیدا کر لیتا ہے۔ میرے معاملے میں بزرگوں کے قول جھوٹے پڑ گئے۔

میری شدید خواہش کے باوجود کس نے اس قابل نہ جانا کہ جائز کام نکلوا کر کچھ دے دیا جاتا...... اور ناجائز کام...... سب کے سب بڑے صاحب کی میز پر پہنچ جاتے تھے۔

میرے جیسا نکھٹو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک دن بیٹھے بٹھائے اتنا بڑا زلزلہ آئے گا کہ ہماری بوڑھی ناتواں زندگی کبڑی ہو کر در در بھیک مانگتی پھرے گی۔

تیسری دنیا کی سرکاروں کے ابھی کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ خنک ایوانوں کے اندر آیا دھاپی کھیلتے کھیلتے اچانک کسی وقت عوام عوام کھیلنا پڑ جاتا ہے اور ایسے وقتوں میں بھول پن میں اکثر ان کے منہ سے بہکی بہکی باتیں نکل جاتی ہیں۔

"درمیانے اور نچلے درجہ کے سرکاری ملازمین کو پلاٹ دیئے جائیں گے۔"

زندگی ایک طویل عرصے سے ضروریات کے پریشر کوکر (PRESSURE COOKER) میں کچھ اس طرح سے گھٹی گلتی رہی ہے کہ میرا کوئی دوست نہیں رہا۔

دفتر کی اونچ نیچ، صاحب کی پھنکار تک گھر آ کر رابعہ بیگم کو ہی سنانا پڑتی ہے۔

عام حالات میں وہ بزاخفش کا کردار بڑی خوبی سے ادا کرتی ہے۔

"رابعہ بیگم...... یہ سب کاغذی ڈرامے چھوڑے جاتے ہیں، پلاٹ وغیرہ قسمت والوں کے نکلتے ہیں، اندھا کھیر نہ ہی دیکھے تو اچھا ہے، ہمیں کیا پڑی ہے خواہ مخواہ سو پچاس فارموں وغیرہ پر لگا کر باقی مہینہ ادھر ادھر کی خوشبوئیں سونگھ سونگھ کر ناک کھجاتے پھریں۔"

میری بز اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑی ہو گئی، اس کے کھر خطرناک انداز میں ہوا میں چلنے لگے...... حکیم اخفش کی کمزور دم حیرانی اور خوف سے دونوں ٹانگوں کے اندر گھس کر پیٹ تھپتھپاتے لگی۔

شام کو سسر صاحب تشریف لے آئے، وہ ہر غلط وقت پر ہمیشہ بر وقت پہنچتے ہیں۔

قصہ سن کر اچھلے اور رابعہ بیگم کو کھینچ کر اپنے وسیع و عریض سینے میں چھپا لیا...... ساون کی کوئی نہ کوئی بدلی ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی ہے، مطلع صاف ہوتے ہی وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔

"تمہیں بھی مبارک ہو...... بس صبح ہی درخواست داخل کر دو...... باقی دوڑ دھوپ کا کام ہم خود کر لیں گے۔"

سسر صاحب کو ہوا میں پھونکیں مارنے کا پرانا مرض تھا۔ ہماری شادی سے پہلے روز ایک نیا سبز باغ لگاتے تھے اماں ان باغات کی سیر کرتے کرتے رخصت ہو گئیں، ان کے بعد برات کو ڈھنگ کا کھانا بھی نہ دیا۔

میں مطمئن تھا...... جن کے پلاٹ نکالنے ہیں، نکل آئیں گے، میری درخواست ڈھیر میں دبی دھول پھانکتی پھانکتی مر مرا جائیگی...... باقی رہا سو پچاس کا نقصان تو وہ......

اماں مرحومہ کو چوزے نکلوانے کا بڑا شوق تھا...... جب بھی کوشش کی مرغی انڈے پی گئی۔

میرا پلاٹ اور وہ بھی لاٹری میں کیسے نکل سکتا ہے؟

نہ صرف پلاٹ نکل آیا بلکہ اگلے مہینے سے قسط بھی کٹنے لگی۔

میں پہلی لنڈی تنخواہ لے کر چلا تو دل مس مس کر رہا تھا...... دفتر والوں کی حسد بھری نگاہوں سے بھی وہ چپ ہو کر نہ دیا۔

رابعہ بیگم نوٹ گن رہی تھی...... مسکین گڈی اس کی لمبی' نازک انگلیوں میں مزید سمٹ گئی۔ ابھی پہلی تھوک زندہ تھی کہ انجام آگیا۔

میں ڈر رہا تھا ابھی اس کی کٹاری آنکھیں اٹھیں گی اور میرے جسم سے گوشت کے ٹکڑے کٹ کٹ کر گرنے لگیں گے...... پھر وہ ان ٹکڑوں کو اکٹھا کر کے اوپر ٹین کی چھت پر منڈلاتے چیل کوؤں کو ڈال آئیگی...... میں دفتر سے واپسی پر تمام راستہ پرندوں کے لڑنے جھگڑنے' لپکنے جھپٹنے کی آوازیں سنتا آیا تھا۔

رابعہ بیگم نے آنکھیں اٹھائیں......ایسی دہکتی' آسمان کو چھوتی آنکھیں تو ہمیں سہاگ رات کی صبح بھی نصیب نہ ہوئی تھیں' پلاٹ زندہ باد۔

کبھی کبھار گائے کے نام پر جاں بلب' خستہ تن بوڑھے بیل کا گوشت کھالیتے تھے...... لنڈے بازار کی دریادلی سے سفید پوشی پردہ پوش تھی' اب کونسا نیلا بازار ڈھونڈیں گے!

رابعہ بیگم بہت پہلے سے سسکتے اخراجات کا گلہ گھونٹنے کے پلان تیار کر چکی تھی' پلاٹ نکلتے ہی اس نے پوری بے رحمی سے ان پر عمل درآمد شروع کر دیا...... میں منہ میں پانچوں انگلیاں ڈالے اس کی شخصیت کے اس نئے پہلو کو دیکھ رہا تھا...... کاش وہ اپنے مظلوم ملک کی وزیر خزانہ ہوتی!

مدت سے برتن صاف کرنے والی ماسی سے بلاوجہ کا جھگڑا مول لیا اور اس سے ہمیشہ کے لئے جان چھڑالی دھوبی پر بار بار کپڑے گم کرنے اور کچھ نہ کچھ پھاڑ لانے کا دوہرا الزام

عائد ہوا اس کے بعد اس شریف زادے نے پلٹ کر ہماری گلی کا رخ نہ کیا۔ اور تو اور پہلوٹھی کی بیٹی کے منہ سے بازاری غذا کا ڈبا تک چھین لیا' پھر برسوں سے سات پردوں میں ڈھکی چھپی غربت نے سٹرپ ٹیز ڈانسر کی طرح ایک ایک کر کے تن کے کپڑے اتار پھینکنے شروع کئے۔ اس کا رقص دن بدن' ماہ بہ ماہ تیز تر ہوتا چلا گیا۔

میں صبح صبح چوروں کی طرح اندھیرا ٹٹولتا نکلتا اور پیدل شائیں شائیں کرتی بھوت سڑکیں ناپتا کبھی وقت پر اور کبھی بے وقت دفتر پہنچ ہی جاتا۔

سنا تھا وقت بلی کے پاؤں گزرتا ہے' ہمارے ٹین کے کوارٹر میں ایک ایک لمحہ ہمالیہ قدموں سے ٹھہر ٹھہر' بچ بچ کر آتا اور صدیوں صحن میں جما بیٹھا رہتا۔

اس دوران انتہائی احتیاط کے باوجود ایک عدد بے ہودگی بھی سرزد ہو گئی اور وہ بھی بیٹی کی صورت میں......دو بیٹیاں!

تنخواہ کٹ رہی تھی اور ہمارے جسموں کیساتھ ساتھ روحوں سے بھی کھال اترنے لگی۔ قسطوں کی بوجھل سلیں رک رک کر' خوب رگڑ رگڑ کر چیونٹی کی چال کھسک رہی تھیں۔

پھر ایک ایسا وقت آیا کہ بس گلے میں کشکول ڈال کر در در بھیک مانگنے کی کسر رہ گئی۔

شاید جہنم کے فرشتے بھی ہم سے تنگ آ گئے تھے' انہوں نے ہمیں اٹھا کر باہر پھینک دیا۔

قسطوں کا پہاڑ یک لخت اوپر اٹھ گیا۔ زندگی نے پھیپھڑے پھیلا کر خوب لمبی لمبی سانسیں لیں۔

کیشیئر نے تنخواہ ہاتھ میں دی...... میں نے گننا شروع کیا اور گنتا ہی چلا گیا۔

میری اندھی آنکھوں کی بصارت لوٹنے لگی۔

بازار میں دوکانیں ہر قسم کے سامان سے پھٹی پڑی تھی...... مجھے پکڑ پکڑ کر' چیخ چیخ کر آوازیں دے رہی تھیں۔ ایک جگہ ایک لہراتی ہوئی ساڑھی کے رنگوں نے میرا دامن

پکڑ لیا...... میں ساری دنیا خرید ڈالنا چاہتا تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا...... ہاتھ سن، بے سدھ اندر ہی پڑا رہ گیا...... اسے جیب سے باہر آنے کی عادت ہی نہ رہی تھی۔

میں نے تازہ کھنکتے نوٹوں کی گڈی رابعہ بیگم کے ہاتھ میں دی۔

اس نے اپنا چشمہ ڈھونڈھ کر، اس کی اترے کندھوں والی کمانیاں کانوں کے پیچھے جمائیں اور نوٹ گننے لگی...... پھر اس نے چشمہ اتار کر میری طرف دیکھا۔

آنکھوں کے پیچھے مردہ شمعوں نے جلنے کے لئے بڑا زور مارا...... انکی روشنی چہرے تک نہ پہنچ پائی۔

بے رحم وقت کا تارینڈو گزر گیا تھا...... سب سے زیادہ تباہی رابعہ بیگم پر ہی آئی تھی۔ اس کے ریشمی چہرے کا رنگ جگہ جگہ سے اڑ گیا تھا...... اور اسکی آنکھوں کے گوشے چلچلاتی دھوپ کے ظالم کوے اپنے تیز نوکیلے پنجوں سے بری طرح کھرچ گئے تھے۔

میں نے بلند آواز میں نعرہ لگایا۔

"لمبی فہرست بناؤ، اپنے لئے، بچوں کے لئے، گھر کے لئے...... سب کے لئے...... سب کچھ خرید ڈالو۔"

سسر صاحب ہمیشہ کی طرح غلط وقت پر بروقت آپہنچے۔

"دونوں کو بہت بہت مبارک ہو...... چلو یہ جنجال گلے سے اترا اور تم پلاٹ والے ہوئے...... لو اس موقع پر ایک اور خوشخبری سنو...... لڑکے والوں سے رخصتی کی تاریخ لیتا آیا ہوں۔"

میری اور رابعہ بیگم کی آنکھیں ملیں اور خون تھوکنے لگیں۔

ہماری پہلوٹھی کی بیٹی کو سترواں سال لگا تھا، ٹھیک ہے بات طے ہو چکی تھی لیکن رخصتی...... اتنی جلدی، ابھی تو سوچنے کی فرصت بھی نہ ملی تھی۔

میں اپنی غراہٹ کا گلہ دباتے ہوئے بول پڑا۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟ ہمارے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔"

سسر صاحب کے وسیع وعریض ماتھے پر کچھ لکیریں، کچھ ٹیلے ابھرے لیکن دم بھر

میں سب کچھ صاف ہو گیا... وہ کھل کر مسکرائے اور میری جان نکل گئی...... اب کوئی نیا عذاب آنے کو تھا۔

انہوں نے اپنی ساری بوڑھی دانش اکٹھی کر کے ہمارے سروں پر دے ماری۔

"لڑکی کا فرض پہلے...... پلاٹ اب اپنا ہو چکا ہے' اللہ اور دے گا۔"

سسر صاحب ہمیشہ کے بہرے ہیں۔ میں نے رابعہ بیگم کی کرب میں گلے گلے ڈوبی خاموش چیخ سن لی تھی۔

تین کوارٹروں کے بیچ والی گلی میں رنگ برنگا تنبو لگا۔ بریانی اور قورمے کی خوشبو نے اس بستی کے سارے دکھ ڈھانپ دیئے۔

ہماری بیٹی ہم سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلی گئی۔

اجڑے ہوئے تنبو میں رابعہ بیگم بانس کا سہارا لئے اجڑی کھڑی تھی' سسر صاحب ہمارے سروں پر آنسوؤں میں بھیگا ہاتھ پھیر کر جا چکے تھے۔

ایک سرے سے دوسرے سرے تک چچھوڑی ہوئی ہڈیوں کی ڈھیریاں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں ان ہڈیوں سے بچتا بچاتا اس کے قریب آیا اور اس کا کھردرا ہاتھ تھام لیا۔

اس کا چہرہ وحشتوں کی راکھ سے اٹا پڑا تھا۔

"اب چھوٹی کا کیا ہو گا؟"

میں نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے تسلی دی۔

"اللہ بہتر کرے گا...... ریٹائرمنٹ میں اب کچھ ہی سال رہ گئے ہیں' اچھی خاصی معقول رقم ملے گی اور چھوٹی تو ابھی بہت چھوٹی ہے"

اس نے بانس چھوڑ دیا...... ایک زخمی سسکی اس کے ہونٹوں سے پھسل پڑی۔

"ہمارا کیا ہو گا؟"

میرے اندر برسوں سے سوئے پڑے لاوے نے پھنکار ماری...... میں نے اسکا ہاتھ جھٹک دیا۔

"سارے سوال میرے لئے ہی رہ گئے ہیں؟"

رابعہ بیگم ابھی تک تنبو کے اندر چھچھوڑی ہوئی ہڈیوں کے بیچ میں کھڑی ہے......

میں غصے میں بلبلاتا ہوا اندر آگیا ہوں......

رابعہ بیگم کا بے رحم سوال مجھے اٹھا اٹھا کر پٹخ رہا ہے۔

"ہمارا کیا ہوگا؟"

اس سوال کا جواب اب اوپر سے ہی آسکتا ہے۔

سب کچھ ڈھادے

تیسری دنیا میں کھجور کے پیڑ پر لیموں لگتے ہیں اور لمبے پروں والے گدھے اڑانیں بھر بھر انہیں کتر کتر کھاتے ہیں، صبح سے شام تک گلی کی بتیاں خوب روشن رہیں، اندھیرے کی پہلی آہٹ پر چپ چپ بجھ گئیں۔ بجلی والے اپنا کام دکھا کر آرام سے گھر جاسوئے تھے۔

اب گلی مکمل طور پر تاریک تھی اور ویران بھی، صرف گھروں کے اندر زرد بلب موتیا اتری انکھوں سے جھپ جھپ جل رہے تھے۔ بلی باجی کے دونوں بیٹے، باہر گلی میں تھڑی پر آکر بیٹھ گئے۔

گھر پر تالا پڑا تھا اور بلی باجی حسب معمول دورے پر تھی۔

بڑا چھوٹا، دونوں ہفتے بھر سے، جذباتی نعروں کے تھپیڑے کھاتے ہجوم کے ساتھ، گھر سے دور مندر ڈھانے جلانے میں مصروف رہے تھے، آج وہ سیتلا مندر ڈھا کر فتح یاب لوٹے تھے۔

چھوٹا ہمیشہ کا بے صبرا تھا، بڑے کا پھولا پیٹ اس کے رال میں ڈوبے جارہا تھا۔

"بھائی...... دس جیبوں والی نیلی پتلون لونگا اور یہ بڑے بڑے پھولوں والی قمیض اور گھٹنوں تک لمبے بوٹ اور......" بڑے نے اپنی ٹیکھی آنکھوں سے اسکے بیسوؤں ٹکڑے کر ڈالے۔

پھر گھروں کی بجلی بھی بغیر اطلاع رخصت پر چلی گئی۔

عورتیں اوپرے ہونٹ پر رینگتی پسینے کی بوندوں کو پھونکیں مارتی، گیلریوں اور چھتوں کی طرف دوڑیں...... بچے اور لونڈے لپاڑے ہاؤ ہو کرتے باہر کو لپکے...... سونی گلی میں برات اترنے لگی۔

بابو گھر بھر کی رسیاں تڑا کر، دونوں ہاتھوں سے بر سر عام ناف کا نچلہ حصہ کھدیڑتا دھنا دھن سیڑھیاں اتر آیا۔

گیلری میں آدھی باہر لٹکی اس کی ماں بین کر رہی تھی۔

"لوٹ آ...... بابو بیٹے لوآ......"

اس نے بلی کے بیٹوں کو تھڑی پر پھیلے دیکھ لیا تھا۔

ایسے بیکار وقتوں میں بابو کی مانگ ایک دم بڑھ جاتی تھی۔

گلی میں بکھرے آوازوں کے سارے اندھے جزیرے بابو کو پکارنے لگے۔ بلی کے بڑے بیٹے کی آواز سب سے اونچی تھی۔

"بابو...... ادھر آ...... لے ٹافی۔"

بابو صحرائی مکھی کی طرح ادھر لپکا۔

"نہیں بھائی...... یہ حرامی کی اولاد اماں کا پیچھا چھوڑ کر نہیں دیتا...... میں اسے قتل کر دونگا۔"

بڑے کے چہرے پر مکاری کے تیز رنگوں میں لت پت مسکراہٹ لپ گئی۔

"صبر...... صبر"

اس نے بڑے اہتمام سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا، باہر نکالا اور جھوٹ موٹ کی ٹافی بابو کی طرف بڑھا دی۔ بابو نے خلا میں انگلیاں چلائیں، نادیدہ ٹافی سے کاغذ الگ کیا، ایک طرف

پھنکا......اور ٹافی منہ میں رکھ لی......اس کے ساتھ ہی اس کا دہانہ ایک کان سے دوسرے کان کی لو تک پھٹ گیا...... کھو کھلی جڑوں سے محروم مسکراہٹ چہرے پر پڑی پڑی سوکھنے لگی۔

بابو کی ماں دم بھر کو گیلری سے ہٹی تو چھوٹے نے دھم بابو کے پیٹ میں دولتی ماری بابو نے ایک جھٹکا کھایا......اس کے چہرے پر پڑی مسکراہٹ مر گئی۔

بڑے نے جلدی سے ایک اور جھوٹ موٹ کی ٹافی جیب سے نکال کر دی ......بابو فوراً من گیا۔

"چلو بابو...... تالیاں ہو جائیں"

بابو نے پنجوں پر اچک کر چاروں طرف پھیلے اندھیرے کا جائزہ لیا' دونوں ہتھیلیاں سیدھی کر کے ابھاروں پر پتھر گٹوں کو دانتوں سے چکچپایا' پھر مکمل بے رحمی سے انہیں آپس میں رگڑا......شڑاپ شڑاپ' برستے کوڑے جیسی گوجدار تالیوں سے ساری گلی تڑپ اٹھی۔

"ڈھادی' ڈھادی" بابو والہانہ رقص کر رہا تھا۔

آوازوں کے اندھے جزیرے ہنستے کھلکھلاتے بولنے لگے۔

"بابو موڈ میں آگیا ہے۔"

"اس معصوم تک کو بابری مسجد کا دکھ ہے"

بابو تھاتو یلی کے بڑے بیٹے نے نچلے ہونٹ تک پھیلی مونچھوں کی چسکی لے کر پوچھا۔

"بابو آجکل کیا کر رہے ہو؟"

"تین مچھلیوں کا جوڑا لایا ہوں......باجرہ کھلا رہا ہوں......سب مر گئیں۔"

اندھے جزیروں میں قہقہوں کا سیلاب آگیا۔

ایک بار پھر بابو کی تالیوں کی بے فطری آواز گلی میں گونج کر اندھیری ہوا میں ساکت جم گئی

بابو ہر کسی کے کام آنے کو تیار رہتا تھا۔

کسی نے موٹر سائیکل دھونے کا سوچا' نل سے پائپ لگا کر سیدھا ہوا اور بابو موجود۔

"ماموں کیا کر رہے ہو......"

"گاڑی دھونے لگا ہوں۔"

"کیوں ؟"

یہ کیوں کھینچتے کھینچتے اتنی لمبی ہو جاتی کہ گاڑی والا لات گھونسہ چلا کر بڑی مشکل سے چھٹکارا حاصل کرتا۔

لات گھونسہ اگر کام نہ کرتا تو ماچس کی جلتی تیلی ضرور کام کر جاتی...... بابو آگ سے بہت ڈرتا تھا۔

بابو ماں سے بڑی بلی باجی پر بچپن سے عاشق تھا۔

تڑکتی دوپہر میں وہ اچانک کہیں سے نازل ہوتا' ایک جست میں سات فٹ اونچی بیرونی دیوار پر چڑھ جاتا اور کہنیوں کے بل لٹک کر ہوا میں معلق ہو جاتا...... اس کی خالی خالی بھوکی آنکھیں بغیر جھپکے گھنٹوں اندر بلی کی تلاش میں بھٹکتی رہتیں۔

بلی باجی کو سنوں گالیوں سے شروع کرتی' بابو کے ادھیڑ عمر ماں باپ کو دنیا بھر کی عورتوں مردوں سے بھرپور جنسی تعلقات کا موقعہ فراہم کرتی' کرسی کے ٹوٹے بازو سے پنجوں پر تن کر اسے ٹھوکے دیتی...... بابو کبھی دائیاں' کبھی بائیاں ہاتھ اٹھا کر اپنا دفاع کرتا رہتا لیکن دیوار سے ٹل کر نہ دیتا...... اور جب بلی باجی ہلکان ہو کر کمرے میں چلی جاتی اور صحن والا دروازہ بند کر لیتی...... تو بھی بابو وہیں دیوار پر ٹنگا وظیفہ عشق ادا کرتا رہتا۔

ایک دن بلی باجی نے جلتے بھنتے گرم پانی کی پتیلی اچھال دی۔

بابو نے پتیلی کہنی پر روکی' وہیں لٹکے لٹکے ہاتھ سے چہرا پونچھا...... پھر آنکھیں پھاڑ کر' پورے منہ مسکرا دیا۔

بلی باجی کی روح میں ایک سنسناہٹ سی ہوئی اور اس کے جسم کی بوٹی بوٹی پھڑکنے لگی۔

"بابو کی آنکھوں میں کچھ ہے" اس نے ایک ہی چکر میں گلی کے ہر گھر میں خبر پہنچادی۔

بلی نے بابو کو مست ملنگ کا درجہ دے دیا تھا...... اب وہ دیوار پر لٹکے بابو کو اکثر کینو' کیلا چڑھا دیتی۔ بابو وہیں لٹکا بلی کی آنکھوں میں گھس گھس کر ڈکر ڈکر سب کھا جاتا۔

بلی سراپا التجا اور احترام بن جاتی۔

"بابو سائیں دعا کر...... دعا کر میرے ان مسٹنڈوں کی سرکاری نوکری لگ جائے' میں کیلوں' نافیوں کا ڈھیر لگا دونگی۔"

ان نعمتوں کا نام سن کر بابو کا منہ کھلتا ہی چلا جاتا۔

بلی باجی ابھی ابھی دوکان پر کھانا پہنچا کر لوٹی تھی۔ بیٹوں کو سر شام گھر دیکھ کر اس کی انگلی منہ میں چلی گئی۔

"مسٹنڈو...... ذرا پہلے آمرتے تو باپ کو کھانا ہی دے آتے"

بلی باجی اپنے شوہر کی دوکان سے پان کھا کر آئی تھی۔ اس کی باچھوں سے سرخی بہہ رہی تھی۔

بڑا غرلیا۔

"تمہیں سو بار کہا ہے پان کھانا ہے تو ڈھنگ سے کھایا کر۔"

بلی باجی کو آگ لگ گئی اور وہ دھڑ دھڑ جلنے لگی۔

"خبردار مجھ پر حکم چلایا تو...... زبان کھینچ کر کتوں کو ڈال دونگی...... کچھ کما کر لاؤ تو بات کرنا۔"

بڑے کی رگیں پھول کر غبارا ہو گئیں لیکن وہ اس کی ماں تھی' وہ اسے جان سے کیسے مار سکتا تھا۔

بیٹوں کو بڑا دکھ تھا کہ وہ ایک پان فروش کے گھر پیدا ہوئے تھے اور ان کی ماں کا نام بلی پڑ گیا تھا اور وہ دن بھر بلی ہی کی طرح گھر گھر گھومتی رہتی تھی اور...... اور حرام کا جنا بابو۔

بلی باجی کڑ کڑ کرتی تالا کھول کا اندر چلی گئی...... بابو کی آنکھیں اس کا ایکس رے کرتیں اس کے پیچھے چل پڑیں۔

بڑے نے اپنے پھولے پیٹ پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرا۔

چھوٹے نے سرگوشی کی۔

"بھائی...... ہمارے علاقے میں تو کوئی مندر نہیں ہے۔"

بڑے کی آنکھیں خوف اور غصے سے پھیلنے لگیں

"چپ رہو...... تمہیں پتلون اور قمیض لے دونگا' جوتے بھی...... سب کچھ۔"

چھوٹے کو اطمینان ہو گیا اب اس کی محبت جاگ اٹھی۔

"بھائی...... کہیں تھیلہ تمہارے پیٹ پر ہی نہ پھٹ جائے۔"

بڑے نے جلدی سے دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھ لیئے۔

"چل...... تو اندر چل...... خبردار جو ماں سے کچھ کہا تو ورنہ......"

بڑے نے اس کا بازو تھاما اور دروازے تک لے آیا

"مندر نہیں گرجا تو ہے...... سب سالے کافر ہیں...... ہمارے دشمن ہیں۔"

اس کے اندر ٹیپ بجنے لگی تھی۔

اس نے چھوٹے کو اندر دھکیل دیا اور اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔

آوازوں کے جزیرے تھک کر خاموش ہو گئے تھے۔ گلی میں لمبی جمائیاں بھٹک رہی تھیں۔

بڑے کے ذہن میں ہلچل ہوئی.

"ابھی کیوں نہ ہو جائے...... رات میں اگر گلی کی بتیاں چل پڑیں تو......"

اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں' اس نے جلدی سے بابو کے کندھے کا سہارا لیا...... پھر اس کے دماغ میں جھپاکا ہوا......

"بابو...... بابو" اس نے بابوں کے دونوں ہاتھ تھام لیئے۔

"آؤ بابو...... تمہیں ڈھیر ساری ٹافیاں دلاؤں۔"

بابو کی آنکھوں سے شیرینی ٹپکنے لگی۔

دوکاندار موم بتی کی میلی' ٹمٹماتی روشنی میں بیٹھا بڑبڑا رہا تھا۔

بڑے نے ٹافیوں کا پیکٹ لیکر پھاڑا اور ایک ساتھ دو ٹافیاں خود اپنے ہاتھ سے

چھیل کر بابو کے کھلے منہ میں ڈال دیں۔

دو گلیاں پار کر کے وہ مین روڈ کے کنارے فٹ پاتھ پر ٹھہر گئے...... سامنے گرجے کا مینار سیاہی اوڑھے' اندھیرے آسمان میں پیوست تھا۔

بڑے نے لرزتے ہاتھوں سے قمیض اٹھائی اور نیفے میں اڑسا پیکٹ نکال لیا...... نوٹوں کی گڈی بھی اوپر چلی آئی...... اس نے اسے جلدی سے نیچے دھکیل دیا۔

"بابو...... یہ لے...... وہ دیوار...... جا چڑھ جا...... اندر اماں ہے...... تمہیں کیلے دے گی۔"

بڑا سڑک کے پار گرجے کی بیرونی دیوار کی طرف اشارے کر رہا تھا...... بابو قدم قدم بڑھے چلا جا رہا تھا۔

وہ آدھی سے زیادہ سڑک پار کر چکا تھا۔ اس نے وہاں رک کر' مڑ کر بڑے کی طرف دیکھا...... پھر اندھادھند گرجے کی بجائے اپنی گلی کی طرف دوڑ لگا دی۔

بڑے کے پاؤں پتھر ہو گئے اور اس کی آواز حلق میں جم گئی......

وہ جتنی تیزی سے چل سکتا تھا' چل پڑا۔

اس کے دیکھتے دیکھتے بابو اپنی گلی کا موڑ مڑ گیا۔

بڑا گلی کا موڑ مڑا تو اسے بابو نظر آگیا...... وہ جست لگا چکا تھا...... اس کی دونوں کہنیاں' دیوار پر اس کی مخصوص جگہ پر جمی تھیں...... پھر ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور گلی کا کلیجہ پھٹ گیا۔

دیواریں چھت کو دھکا دے کر سڑک پر بچھ گئیں...... آوازوں کے اندھے جزیروں میں بھگدڑ مچ گئی۔

باہر والی دیوار کے ملبے نے بابو کا جسم ڈھانپ رکھا تھا...... اس کے کھلے' پھٹے ہونٹوں کے بالکل پاس' سرخ فٹ پاتھ پر دو آدھی چوسی ٹافیاں اجڑی اجڑی سی پڑی تھیں۔

روشنی ابھی تک غائب تھی......

کرائسسز

چنگیز خان کو تو گھٹی کی جگہ تلوار کی نوک پر زندہ انسانی خون چٹایا گیا ہو گا۔
ہمارا جلد داعظم ہمیں لذیذ وعدوں کے ٹکڑے ڈالتا' ہمارے ننگے سروں پر پھد کتا' اس مقام پر پہنچا ہے اب اس کی آنکھوں میں ہزاروں سور گھس گئے ہیں' اللہ تعالےٰ نے کسی مصلحت کے تحت اسے اولاد سے محروم رکھا ہے تو اس کا بدلہ ہم سے کیوں لے رہا ہے؟

نواز نے اپنے آپ میں سے جھانک کر باہر دیکھا تو اسے اپنی بیوی نظر آئی۔
کیا بدمست سورنی کی طرح دھن دناتی' دھاڑتی پھرتی تھی! سارا گھر اس کی ٹھوکر میں تھا' اب کاکروچ کی طرح دراڑیں ڈھونڈتی پھرتی ہے۔
اس کا جی چاہا کہ وہ ایک تباہ کن قہقہہ لگائے' اس نے بڑی مشکل سے بھاگتے قہقہے کو دم سے پکڑ کر واپس کھینچا۔
"نواز کچھ کرو...... کچھ نہیں کر سکتے تو میرا گلہ ہی گھونٹ دو۔"

'ہوں...... شیرنی شیری سے چلی جائے' ہیکڑی سے نہیں جاتی'

اس نے طویل شادی شدہ زندگی میں بیوؤں بار اس زہریلی عورت کا گلہ گھونٹا تھا دو چار بار اچھی طرح فارغ ہو کر پوری احتیاط سے رات کی پردا پوش خاموشی میں اسے مختلف ویرانوں میں دبا بھی آیا تھا...... لیکن وہ ہر صبح پہلے سے بھی زیادہ پھٹے منہ اور کانٹوں والی زبان کے ساتھ موجود ہوتی تھی۔

اس نے شعوری طور پر کوشش کی کہ اسکے دو چار آنسو ہی نکل آئیں...... ساتوں آسمانوں کا بوجھ جو اسے پاگل بنا چکا ہیں' کچھ تو ہلکا ہو جائے...... ہر چیز عین موقع پر دھوکہ دے جاتی ہے۔

اس نے عورت کو پہلی بار بے بس دیکھا تھا...... اگر یہ کرائسز نہ ہوتی تو اسے یقیناً بے پناہ خوشی ہوتی۔

وہ تیزی سے اٹھا اور پچھلی طرف باہر برامدے کی طرف لپکا۔

اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں' غلاظت چاٹنے کے علاوہ منہ پر بھی ملنا پڑے گی۔'

بابا چارپائی پر پڑے سو رہے تھے اماں کی انگلیاں تسبیح کے دانوں کو دھکے دے رہی تھیں۔ دوسرا ہاتھ ابا کے گھٹیا سے پھولے گھٹنے کو سہلا رہا تھا۔

یہ پرانی قسم کی بیویاں نسبتاً بہتر ہوتی ہیں...... کبھی کبھا شوہروں کو اپنا سمجھ لیتی ہیں۔

اماں عمر کا خیال کئے بغیر کنواری ہرنی کی طرح بدکیں اور عین دروازے کے بیچ میں آکھڑی ہوئیں۔ ان کی اجنبی حلقوں میں گھٹی آنکھوں میں پھنکاریں تھیں۔

"اماں کیسی ہیں ؟ابا......"

"تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا...... جلد ہی دونوں مر جائیں گے۔"

اس نے تھوک نگلنا چاہی' وہیں اٹک گئی تھی' آگے جا رہی تھی نہ پیچھے۔

اماں کے سفید سر کے اوپر سے تاریکی میں کچھ کچھ نظر آنے لگا تھا۔

ابا چارپائی سے اٹھ گئے اور اپنے سوجے پاؤں دبا دبا کر چپل میں ڈال رہے تھے۔

"آنے دو...... اسے اندر تو آنے دو۔"

اماں بس ذرا ساسر کیں۔

'کمرہ واقعی بہت گرم ہے۔ یہ ایس بیس ٹوز کے انگارے کسی بڑے ہی ظالم شخص نے ایجاد کیئے ہیں کرائسز سے نکل لیں تو کچھ کریں گے۔ لعنت ہے بڑے بھائی پر...... مکمل ایئر کنڈیشنڈ کوٹھی میں رہتے رہتے خود ایئر کنڈیشنر سے زیادہ ٹھنڈا ہو گیا ہے کولڈ بلڈ ڈ اینیمل۔ ماں باپ میرے اکلوتے تو نہیں' تھوڑے بہت تو اس کے بھی ہونگے۔

"بابا آج کل اخبار نہیں دیکھ رہے کیا؟"

"میرے پیارے بیٹے...... ایک طویل عرصے سے تیری بیوی نے بچوں اور دوسری بہت ساری اشیاء کے ساتھ اخبار کا داخلہ بھی اس طرف ممنوع قرار دے رکھا ہے۔"

بہو پھڑ پھڑاتی ہوئی' اپنے پورے وزن کے ساتھ دروازے کی طرف لپکی۔ دروازے پر جمی اماں اس بگ بینگ سے بچنے کے لئے خود بخود ایک طرف ہٹ گئیں۔

"یہ دیکھئے بابا...... یہ...... یہ۔"

بہو اخبار بابا کے سامنے پھیلا چکی تھی۔ شہادت کی انگلی سے جلی سرخی میں سوراخ ہو گیا۔

بابا چشمے کو اوپر نیچے کرتے سرخی پڑھ گئے۔

"کیا ایسا ممکن ہے؟ کسی شیطان رپورٹر نے جڑ دی ہو گی' آج اپریل کی پہلی تو نہیں؟"

لبا سٹپٹا گئے' موسم بہار تو کب کا لد چکا تھا۔

"اس خبر کو ریڈیو' ٹی وی سے بہبود آبادی والے بار بار نشر کر رہے ہیں۔"

"بابا...... ہم کیا کریں؟"

ایک طویل' بے حد طویل عرصے بعد نور چشم نے بیٹا بن کر باپ سے سوال کیا تھا...... وہ اکثر باپ بنا رہا۔

بابا کے دل پر جمی دھول کہیں کہیں سے جھڑ گئی...... انہوں نے دل ہی دل میں

اپنے پوتے پوتیوں کی گنتی کر ڈالی۔

"چار...... بس ایک زائد ہے...... میں نے تمہیں سینکڑوں بار اشاروں کنایوں میں سمجھایا تھا' پر تم......"

"بابا...... یہ سب آپ کی چہیتی بہو کا کیا دھرا ہے...... وہ تو میں آڑ گیا ورنہ......"

اماں نے آنکھیں تسبیح کے پیچھے چھپا کر موند لیں' اتنی صاف گفتگو ان سے برداشت نہ ہو پائی۔

"مجھے تو نئے حکمراں شروع سے ہی پاگل لگتے تھے...... تم ان کی بہت حمایت کیا کرتے تھے۔"

نواز چڑ گیا۔

"کیسا باپ ہے' اس زندگی موت کی کشمکش میں بھی اپنی برتری ثابت کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔"

بابا نے سمندر کے گہرے پانیوں سے سر نکالا۔

"میں بیمار رہتا ہوں...... کچھ خود' کچھ اولاد کی آنکھوں سے خاصی دنیا دیکھ لی ہے۔ اب......"

اماں نے تڑاخ سے تسبیح شوہر کی کمر پر ماری' بابا کی زبان وہیں رک گئی۔

"بابا...... آپ مسئلہ پوری طرح نہیں سمجھ پائے' آپ کی قربانی سے یہ بلا نہیں ٹل پائے گی' ایک خاندان میں پانچ سے جتنے زیادہ افراد ہیں' وہ مانگے جا رہے ہیں...... آپ تو صرف دو ہیں...... آپ اور اماں۔"

اماں بغیر سمجھے پورا مسئلہ سمجھ گئی تھیں اور اس کا حل بھی تلاش کر چکی تھیں۔

"اس کتیا کو دے دو...... اس سے خدا اور اس کا رسول بھی تنگ ہیں"

بہو نے ایک لمبی دھاڑ ماری اور فرش پر لوٹنیاں لگانے لگی۔

"ہاں...... ہاں...... مجھے بھجدو...... میرے بعد میرے بچے کون دیکھے گا؟ میرے بچے...... ہائے میرے بچے"

نواز نے لپک کر بیوی کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ مارا...... اس کے اندر ایک چمک سی ہوئی...... اس نے دوسری بار ہاتھ اٹھایا...... بیوی جھکائی دیکر وار بچا گئی اور دوڑ کر دور دیوار کے ساتھ جا کھڑی ہوئی...... وہ حسرت سے اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگا' دیکھتا چلا گیا۔

بابا شاید مراقبے میں چلے گئے تھے' نواز نے انہیں بلایا۔

"بابا...... آپ تو تجربہ کار ہیں' کچھ سوچیں۔"

"ہوں...... بس ایک بچہ زائد ہے' بہو تم بہت بری ہو' تم نے ہمیں اس گرم چوہے دان میں بند کر رکھا ہے' کھانا ہمیں کتوں کے راتب سے بدتر دیتی ہو پنشن نہ ہوتی تو ہم ننگے پھرتے' تمہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مسٹر نواز تمہاری آنکھوں پر یہ عورت چربی بن کر چڑی بیٹھی ہے' تمہیں آپریشن کی ضرورت ہے...... اس کے باوجود تم دونوں کا بچوں کی وجہ سے زندہ رہنا ضروری ہے ہم دونوں کام کے نہیں...... ہم سب کو ہمت سے حقیقت کا سامنا کرنا ہوگا...... لاٹری ڈالے لیتے ہیں جس بچے کا نام نکلے خدا کی رضا اور تمہارے گناہوں کی سزا جان کر......"

بابا کی آواز لڑکھڑانے لگی۔

بہو نے ایک نعرہ مستانہ لگایا اور تڑپتے ہوئے فرش پر بے پیندے لوٹے کی طرح لڑھکنیاں کھانے لگی۔

اماں نے تسبیح کے بیچ میں سے جھانکا۔

"اسے بھیج دو' بچے میں پال لونگی."

اچانک ساری آنکھیں دروازے کی طرف اٹھ گئیں' سب سے بڑا منصور اچانک دروازے میں آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"میں اندر آسکتا ہوں؟"

نواز نے اسے خونخوار نظروں سے گھورا لیکن وہ وہیں جما کھڑا رہا۔

دادا نے بازو پھیلا دیئے اور وہ سیدھا ان سے گھس گیا۔

"دادا ابو میں نے پزل حل کر لیا ہے' تھا بڑا مشکل...... پوری رات اس پر لگا رہا

ہوں۔"

"بتاؤ' بتاؤ" ایک ساتھ چار آوازیں گونجیں۔

"دادا ابو ایک شرط پر بتاؤنگا...... کوئی مجھے آپ کے پاس آنے سے نہیں روکے گا۔"

اس کی آنکھیں ماں کی طرف اٹھ گئیں۔

"منظور...... منظور...... سب کچھ منظور" اس کی ماں دیوار سے چمٹی بڑبڑائے جا رہی تھی۔

"سب لوگ غور سے سنئے...... اس گھر میں دو خاندان رہتے ہیں...... ایک نہیں...... ایک آپ کا اور دوسرا ابو کا۔"

"ہمیں ایک کی بجائے دو فارم بھرنے ہونگے...... ایک میں تین بچے' امی اور ابو...... دوسرے میں آپ دادی جان اور میں"

دادی نے ایک طرف رکھی تسبیح اٹھائی۔

"یہ چڑیل پھر بچ گئی"

پورے گھر کو کرائسز کی مار پڑ رہی تھی ایک دم سے چھٹ گئی۔

لبا جان میں آج ہی مستری کو بلواتا ہوں' یہ چھت بدل جائے گی اور اگر کس کو اعتراض ہے تو اسے بھی بدل دیا جائیگا

بہو دونوں ہاتھ جوڑے کمرے میں دھمال ڈال رہی تھی۔

"معافی...... معافی...... معافی......"

ایک بہت ہی طویل عرصے بعد ہنسی نے اماں کے اجڑے ہونٹوں کو گدگدی کی۔

باہر گاڑی کا ہارن منہ پھاڑ پھاڑ کر بجنے لگا' بجتا چلا گیا۔

بہو اچانک زمین پر گری اور لوٹنیاں لگانے لگی۔

"آگے...... ظالم آگئے۔"

گوشت کا تھلتھلاتا پہاڑ' اپنے جسم کی پروا کئے بغیر تنگ دروازے میں پھنستا' پھسلتا کمرے میں آگھسا' وہ اماں کو گلے لگانے آگے بڑھا' اماں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے وہیں

روک دیا۔

مواز ہانپتا ہوا خالی کرسی پر گر گیا.

وہ ایک بار پھر سانسوں کے بھونچال پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوا اٹھا اور بابا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

چلیں بابا...... میں آپ کو لینے آیا ہوں."

اس نے حقارت سے چھوٹے بھائی کی طرف تھوک آلود مسکراہٹ تھوکی۔

"یہ زن مرید آپ کو کیا رکھے گا۔"

وہ بابا کا ہاتھ پکڑ کر کھینچے جا رہا تھا...... اماں نے تڑاخ سے تسبیح اس کے گنجے سر پر ماری...... وہ پیچھے ہٹا تو نواز نے اسے گلے سے پکڑ لیا۔

اماں نے جلدی سے تسبیح کے دانے سرکائے.

اسکے دو بچے زیادہ پڑ رہے ہیں۔"

بابا کھل کر مسکرائے' ان کی مسکراہٹ بڑی گہرائی سے اٹھی تھی۔

"ہا...... ہا...... یہ نیا حکمران اتنا احمق بھی نہیں ہے جتنا ہم......"

بابا نے گلا صاف کیا اور گرجے۔

"رک جاؤ...... دونوں...... ورنہ......"

دونوں بھائی ایک دوسرے سے الگ ہو کر ہانپنے لگے۔

"سنو...... مواز تمہارے دونوں بچے اور نواز تمہارا ایک بچہ ہمارے ساتھ رہیں گے...... منظور ہے؟"

دونوں نے سر جھکا دیئے۔

بابا نے اماں کی آنکھوں میں جھانکا...... ان کی مردنی دور ہو چکی تھی اور وہاں میٹھی میٹھی قندیلیں روشن تھیں۔ پھر بابا اچانک سوتے میں اٹھ کر بیٹھ گئے انہوں نے جلدی جلدی چشمہ صاف کیا اور کھلے دروازے میں سے دور تک جھانکا...... باہر تیز دھوپ کے سوا کچھ نہ تھا اور اوپر ایس پیس ٹوز کی چادریں دہک رہی تھیں۔

بھیڑیا اور میمنہ

بھیڑیے نے اپنے صحرا پیٹ کو ٹھنڈے شفاف پانی سے خوب اچھی طرح سیراب کیا...... پھر سر اٹھا کر ایک لمبی مطمئن سانس کھینچا۔

اچانک اس کے نگاہیں نیچے پیاس بجھاتے ننھے میمنے پر جار کیں...... اس کے خوانخوار ناخن پنجوں کو دھکیل کر باہر آگئے اور اس کے حلق سے خوفناک غراہٹ اچھل گئی...... وہ چار چھلانگوں میں میمنے کے سر پر آکھڑا ہوا۔

پانی میمنے کے حلق میں پتھر ہو گیا اس کے جسم کا ایک ایک حصہ پھڑکنے لگا اور اس کے حلق سے ابکائی نما سسکیاں پھوٹنے لگیں۔

بھیڑیے کو یہ منظر ہمیشہ اچھا لگتا تھا...... اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

پھر اچانک اس کے پیٹ میں ایک سرے سے دوسرے تک درد کی تیز چھری پھر گئی...... اس کے ناخن پنجوں میں دبک گئے اور اس کے اندر ظلم کا درخت کملا گیا۔

وہ روزانہ صرف ایک جانور کھاتا تھا۔ لیکن آج صبح صبح اس نے اپنا راتب ڈبل کر دیا

تھا...... اسے اس بدمعاش ہرن پر شدید غصہ آیا جو اس کے پیٹ میں دھرنا دے کر بیٹھ گیا
تھا...... اور کسی صورت آگے بڑھ کر نہ دے رہا تھا۔

اسکو نیا کھیل سوجھا...... وہ اپنی تکلیف دبا کر میمنے کے بالکل قریب آگیا اور اپنے پنجے
سے اس کی نرم پشت سہلانے لگا۔

میمنے کی بچی کچھی روح بھی پرواز کو تیار ہو بیٹھی۔

"اچھے میمنے...... ڈرو مت...... اب ظلم کے دن ختم ہو گئے ہیں۔"

بھیڑیئے کے الفاظ سہمے ہوئے میمنے کے کانوں سے ٹکرا کر جنگل کی ہری خوشبودار
گھاس پر سوکھے پتوں کی طرح بکھر گئے...... پھر ہوا ایک جھونکا انہیں اڑا کرلے گیا۔

بھیڑیا بالکل اس کی ماں کی طرح اس کے جسم سے جسم ملا کر کھڑا تھا۔

"پیارے میمنے بیٹھ جاؤ...... اب کوئی کسی کو نہیں کھائے گا...... کسی کو کسی پر ظلم
کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔"

میمنہ خوف زدہ ہچکیوں میں اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا تھا...... بھیڑیئے نے
الجھا کر رکھ دیا تھا۔

وہ بھیڑیوں سے بخوبی واقف تھا۔ اس کی ماں اسے لوریوں کے ساتھ ان کے ظلم کی
داستانیں سناتی آئی تھی...... پھر اس کے جڑواں بھائی والا قصہ......

بھیڑیا شاید ایک ہی طرح سے شکار کرتا کرتا اکتا گیا ہے...... آج وہ نئے انداز سے
اسے زیادہ لذیذ بنانا چاہتا ہے'

زندگی کا ایک لمحہ...... موت کے پنجے میں تڑپتا ہوا بھی فوری موت سے بہتر ہے۔

میمنے نے ہمت کر کے زندگی میں پہلی بار کس بھیڑیئے کی آنکھوں میں جھانکنے کی
کوشش کی۔

یہ کیسا بھیڑیا ہے! اس کے پنجوں کے ناخن نہیں ہیں...... اس کی آنکھوں میں موت
کی سرخی نہیں ہے! اور یہ گیدڑ کے لہجے میں بات کرتا ہے!

میمنہ اپنے آپ کو لپیٹ کر گھاس پر بیٹھ گیا...... اس کی نگاہیں دور دھند میں آنکھ

پچولی کھیلتی پہاڑیوں سے چھم چھم اترتے چلبلے پانی کو حسرت سے دیکھنے لگیں۔

بھیڑیئے نے ایک زور دار' بدبو میں لتھڑا ڈکار اچھالا...... اس کے ٹھنے ہوئے معدے کو چہل قدمی کی ضرورت تھی...... معصوم میمنے...... ہم دونوں بھیڑیا اور میمنا...... ایک ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر دور دور تک جنگل میں گھومتے ہیں تاکہ سب جانوروں کو اس انقلاب کی خبر ہو جائے اور وہ کھلے بندوں زندگی کر سکیں۔"

میمنے نے آنکھیں بند کیں' پھر کھولیں...... وہ ابھی تک زندہ تھا اور جاگ رہا تھا۔

آزاد چلبلا پانی دھندلی پہاڑیوں سے اتر کر مزے مزے سرکتا دور نیچے اندھے موڑ کی جانب بڑھے چلا جا رہا تھا۔

میمنے کے خیال سے بھیڑیا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

سب سے پہلے درختوں میں محفوظ پرندوں کی نظریں اس بے جوڑ جوڑے پر پڑیں اور انہوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہ چیخ چیخ کر میمنے کو بھیڑیئے کی مکاری سے آگاہ کرنے لگے۔

بھیڑیا ان کی چیخ و پکار سن کر تلخ حقارت سے ہنسا۔

"یہ اوپر محفوظ بیٹھے شور شرابا کرتے رہتے ہیں' اڑتے پھرتے ہر کس کو ٹھونگیں مارتے ہیں' انکا بس یہی کام ہے۔ ان کا جنگل کے مسائل سے کوئی واسطہ ہے نہ انہیں کوئی دلچسپی ہے...... بہت جلد انقلاب کی تیز آندھی ان کے بے جڑ درخت اکھاڑ پھینکے گی اور ان کا نام و نشان مٹ جائے گا۔"

میمنے نے کچھ سمجھے بغیر فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

پرندے تھوڑی دیر چیخنے چلانے کے بعد چپ ہو گئے۔

بھیڑیا اور میمنہ گھنے درختوں کی چھاؤں سے نکل کر پانی کے غلیظ جوہڑ تک آ پہنچے۔

اچانک بھیڑیئے نے اپنی سانس روک لی...... اس کی تھوتھنی پر ناگواری کی کئی تہیں چڑھ آئیں۔

آہٹ سن کر کیچڑ میں چھپے سارے جانور شڑاپ شڑاپ چھلانگیں لگا کر ٹھنڈے

پانی میں کود گئے۔

بھیڑیئے کے چہرے پر گھنی اداسیوں نے ڈیرے ڈال دیئے۔ وہ تھوڑی دیر گم صم اس مخلوق کے دکھ میں غوطے کھاتا رہا۔

"یہ بے چارے خود اپنے حال سے بے خبر ہیں' ہم ان کے لئے بہت کچھ کریں گے۔ ان کے جوہڑ کے کنارے سونے چاندی کے بنا دیں گے۔ ایک دن انکا احساس جاگے گا اور یہ سب ہمارے ساتھ آملیں گے۔"

میمنے کا دماغ مسلسل گردش میں تھا۔ اس نے ایک دن مین اتنا کچھ دیکھ اور سن لیا تھا کہ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ

بھیڑیا...... اور اس قدر اداس دکھی...... اور اس کی آنکھوں میں ظلم کے زہر کی بجائے ملائمت اور اس کی زبان امرت ٹپکاتی......

قیامت آنے والی ہے...... یا پھر آچکی ہے

آہستہ آہستہ جنگل تاریکی اوڑھ کر سونے لگے گا...... بھیڑیا تھک کر بھرے پیٹ کی نیند سو جائے گا اور وہ بھی واپس ندی پر جا کر اپنی درخت' جھاڑی جھاڑی بھٹکتی ماں کو ڈھونڈھ کر اس کی آغوش میں سر رکھ دے گا۔

اچانک بھیڑیئے کی آواز اسے خوابوں کی دنیا سے باہر کھینچ لائی۔

"پیارے میمنے...... اس طرف دیکھ...... جوہڑ کے اس کنارے گھاس کتنی لمبی اور رسیلی ہے...... کھاؤ...... آج خوب پیٹ بھر کر کھاؤ...... تم بہت دبلے ہو' تم پر گوشت چڑھنا چاہیے۔"

جب اس کا پیٹ لد گیا تو وہ بوجھل قدموں اور بہیے ذہن آکر بھیڑیئے کے قدموں میں لیٹ گیا...... بھیڑیا اپنے پنجے سے اس کی لمبی نرم اون کو سہلانے لگا' سہلاتا رہا۔

ٹھنڈی خوشگوار' خوف سے خشک ہوا اس کے کانوں میں اٹھکیلیاں کر رہی تھی' اس کی پلکیں ڈھیلی پڑنے لگیں' پھر مر گئیں۔

بھیڑیئے کو یہ منظر بڑا اچھا لگا۔

'زندگی کا سارا مزہ اس میں ہے...... بھلا یہ کیا ہوا کہ دیکھا' ٹوٹ پڑے اور ہڑپ کر گئے'

میمنہ خوابوں کے جزیروں میں خواب بن رہا تھا۔ اس کے جنگل کے درختوں کے تنے چاندی کے تھے اور شاخیں سونے کی...... پتے زمرد کے اور پھل پھول نور کے...... سب جانور چہروں پر مسکراہٹوں کی کلیاں سجائے ہر آنے جانے والے سے گلے مل رہے تھے...... دور دور تک کہیں ہڈیوں کے ٹوٹنے اور چیخنے کی آوازیں نہ تھیں۔

پھر اچانک اس کا جڑواں بھائی خون میں لت پت کہیں سے آ ٹپکا...... وہ ندی پر پانی پی رہا تھا...... اوپر پانی پیتے بھیڑیے نے پھنکار ماری۔

"تم میرا پانی گندہ کر رہے ہو"

"حضور پانی تو آپ کی طرف سے نیچے میری طرف......"

"پھر کسی دور میں تیرے باپ نے ہمارا پانی گندہ کیا ہو گا۔"

اس کے بھائی کی ایک لمبی چیخ بھرے پرے جنگل میں بکھر گئی جسے کسی نے نہ سنا...... اس کی ہڈیوں کے ٹوٹنے اور چیخنے کی آوازیں آنے لگیں' آتی رہیں' وہ اپنی ماں کے ساتھ جھاڑیوں میں چھپا سارا منظر دیکھ رہا تھا...... اس کی ماں سسکیاں بھینچے رو رہی تھیں' ابھی تک روتی ہے۔

میمنے کی آنکھ کھل گئی...... اس کی اگلی ٹانگیں ہوا میں چل رہی تھیں اور پچھلی ٹانگیں اکڑ کر نرم گھاس کے نیچے نرم چکنی مٹی میں دھنس گئی تھیں۔

وہ اٹھ کر بھاگنے کو تھا...... بھیڑیے کی ریشمی آواز اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔

'کیا کوئی بھیانک خواب دیکھ رہے تھے؟ ہمیشہ خوشگوار اور اونچے خواب دیکھا کرو۔ خوابوں کی ایک اپنی دنیا ہوتی ہے۔"

بھیڑیا اسے تھپکتا رہا...... کافی دیر بعد اسکا تھر تھراتا جسم جا کر ساکن ہوا۔

بھیڑیے کی تمام تر شفقت اور محبت کے باوجود اس کے اندر خوف کی رینگتی چیونٹیاں مرکز نہ دے رہی تھیں۔ اس نے ایک ڈرتی ڈرتی نظر بھیڑیے پر تھوتھنی سے لیکر

دم تک ڈالی۔

بھیڑیا کہیں سے بھی خطرناک نہ لگتا تھا اس کے دانت ہونٹوں کے پیچھے بند تھے۔ اس کے تیز ناخون والے پنجے بالوں کے گچھوں میں چھپے تھے اور اس کی آنکھوں سے محبت کی پھوار برس رہی تھی...... لیکن اس کا ذہن بھیانک خواب سے نکل کر نہ دے رہا تھا۔

بھیڑیے کا پیٹ لاکھ بھرا ہو' انتظار تھوڑا کرتا ہے' خصلتاً گھٹیا ہے' چیر پھاڑ کر ادھر ادھر ڈال دیتا ہے...... تاکہ آنے والے کل اس کی ضرورت پوری ہو سکے...... بھیڑیے کی خصلت بدل گئی ہے؟ ماں تو ہمیشہ کہتی ہے کہ خصلتیں نہیں بدلا کرتیں...... کیا کبھی کوئی میمنہ بھی بھیڑیا بنا ہے؟

"کیا سوچ رہے ہو دوست؟" وہ بھیڑیے کی رس برساتی آواز میں ڈوبنے لگا...... ایک میٹھی مسکراہٹ خود بخود آکر اس کے چہرے پر آبیٹھی۔

"میرے بھائی ہم جنگل کے سب جانور پاگل ہیں...... جنگل ہریالی سے بھرا پڑا ہے' ہاتھی اور گھوڑے بھی تو ہیں کتنے مضبوط اور تنومند ہیں! اب ہم گھاس پر گزارا کیا کریں گے...... اس سے ہماری طاقت میں کوئی کمی نہ آئے گی۔ اس سلسلے میں اکثر میری گفتگو شیر اور چیتے سے بھی ہوتی رہتی ہے' کچھ عرصے سے ریچھ بھی ہماری محفلوں میں شریک ہونے لگا ہے...... بہت جلد اس جنگل کو جنت میں بدل دیں گے۔"

بھیڑیے نے ایک طویل نیند میں لتھڑی انگڑائی لی اور گرتی پلکوں کو بڑی مشکل سے تھوڑی دیر کو روکا' آنکھوں ہی آنکھوں میں میمنے کو بوسہ دیا اور پھر سو گیا۔

بھیڑیا کچی جھوٹی نیند میں بڑبڑا رہا تھا۔

"میرے میمنے جاؤ...... تمہاری ماں تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے مرنے والی ہو گی...... وہ بڑی خوش نصیب ہے...... آج کا دن ہم دونوں کے لئے اور پورے جنگل کے لئے یادگار رہے گا...... اب جاؤ اور کل صبح ندی پر آنا نہ بھولنا...... میں تمہارا منتظر رہونگا...... کل ہم ایک اور اچھے دن کی بنیاد رکھیں گا۔"

بھیڑیے کی تھوتھنی اس کے اگلے پنجوں پر رکھی تھی۔ اس کے ہونٹ سکڑ گئے

تھے اور تیز دانت باہر جھانکنے لگے تھے' اس کے بالوں کے گچھوں کے پیچھے نوکیلے ناخن کھڑے ہو گئے تھے۔

میمنے کو کچھ نظر نہ آیا...... وہ اس نئی دوستی کے قالین پر اڑ تا جلد از جلد اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا تا کہ وہ اپنے ہم جنسوں کو آج کا واقعہ سنا سکے۔

وہ جانتا تھا اس کی باتوں پر کوئی یقین نہیں کرے گا...... وہ دوہراتا رہے گا۔ کل صبح جب اس کی ہم جنس اسے بھیڑیئے کی حفاظت میں گھاس کھاتے' اچھلتے کھیلتے دیکھیں گے تو انہیں یقین کرنا پڑے گا...... وقت کے ساتھ ساتھ سب اس کے بھائی والا واقعہ بھول جائیں گے۔

وہ خراماں خراماں اچھلتا کودتا چلتا رہا...... اس کے لمبے کان ٹپ ٹپ اس کی گردن پر بج رہے تھے اور شام کی گیلی' معطر ہوا اس کے کانوں میں گنگنا رہی تھی۔

اس نے سب سے پہلے یہ خبر اپنی ماں کو سنائی جو اس کی تلاش میں پاگل ہو چکی تھی۔

ماں نے کچھ نہ سمجھا' کچھ نہ سنا......

وہ اسے اپنے ساتھ چمٹا چمٹا کر گھٹتی رہی...... اس کے زندہ لوٹ آنے پر اس کے کلیجے میں اچکتے مروڑوں کو کچھ سکون آگیا۔ وہ اس کا کان منہ میں پکڑے اسے ندی سے دور گھنی جھاڑیوں میں لے آئی اور بہتی آنکھوں سے اسے لوری دیکر سلانے کی کوشش کرنے لگی۔

میمنہ بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتا اور بھیڑیئے کا قصہ لے بیٹھتا...... پھر بہت رات گئے کس وقت نیند نے اسے دبوچ لیا۔

صبح وہ خاصی دیر سے اٹھا...... سورج کب سے پتوں سے چھن چھن کر اسے جگا رہا تھا۔

اس نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا...... ماں کہیں نظر نہ آئی...... وہ اٹھا اور اچھلتا کودتا ندی کی طرف بھاگ لیا...... اس کا ننھا سا دھڑکتا دل اسے کہہ رہا تھا کہ اس کا اچھا بھیڑیا وہاں ضرور اس کا انتظار کر رہا ہو گا۔

اچانک اس کی روتی ہانپتی ماں ادھر آنکلی اور اس پر برسنے لگی۔

"تم ہر چیز بھلا بیٹھے ہو...... صبح کے وقت سارے خطرناک جانور ندی پر پیاس بجھانے آتے ہیں۔"

ماں نے اسے کان سے پکڑا اور اسے جھاڑیوں کی طرف گھسیٹنے لگی۔

میمنے نے اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوشش کی لیکن پھر اپنی بے بسی دیکھ کر اس نے پوری قوت سے ماں کو ٹکر ماری۔ وہ اس غیر متوقع اور اچانک حملے سے سنبھلنے نہ پائی تھی کہ میمنہ اس کی بغل سے نکلا اور ندی کی طرف اندھی دوڑ لگادی۔

ماں کافی دور تک اس کے پیچھے بھاگی...... پھر ٹھٹھک کر رک گئی اور بوجھل قدموں اور بوجھل آنکھوں سے آہستہ آہستہ گھنی جھاڑیوں کی طرف لوٹ آئی اور وہاں چھپ کر دور افق میں گم ہوتی ندی کو دیکھنے لگی۔

میمنہ کنارے پر پہنچ کر رک گیا...... اس نے پہلے ندی کے اوپر پھر نیچے دیکھا...... بھیڑیا ابھی نہ آیا تھا۔

ندی کا ست روپانی بہے چلا جارہا تھا......

میمنے نے سر اٹھایا...... ٹھنڈا شفاف پانی اس کے حالت کو رونق بخشتا معدے میں اترنے لگا۔

بھیڑیئے کی خوفناک غراہٹ نے اس کے کانوں کے پردے پھاڑ ڈالے

تم میرا پانی گندہ کر رہے ہو۔"

بھیڑیئے گے نوکیلے دانت اس کے ہونٹوں سے باہر لٹک رہے تھے...... اس کے لمبے ناخن پنجوں سے باہر دانت کچکچا رہے تھے۔

"حضور پانی تو آپ کی طرف سے......"

بھیڑیا چار چھلانگوں میں اس کے سر پر آکھڑا ہوا۔

میمنے نے روکتی سانسوں میں کچھ کہنے کی کوشش کی، کچھ یاد لانے کی کوشش کی......

بھیڑیئے کی آنکھوں میں ظلم کی سرخی دیکھ کر الفاظ اس کے ہونٹوں کے اندر ہی مر گئے۔

بھیڑیے نے ایک جھٹکے سے اس کی گردن توڑی...... جنگل میں ہر سو لہو کی بو پھیل گئی۔

بھیڑیے نے گوشت ادھیڑتے ہوئے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"بیوقوف احمق میمنہ...... اتنا بھی نہیں جانتا کہ حیوانی حقوق کا دن سال میں صرف ایک دن منایا جاتا ہے...... روز روز نہیں۔"

خاموش جنگل میں ہر طرف صرف ہڈیاں ٹوٹنے اور چیخنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

نئے رشتے

شڑاک...... بابو تیل ٹپکتی مشعل کی طرح سر سے پاؤں تک بھڑک اٹھا۔

"ادھر جاؤ...... سڑک کے پار' بھڑوے ادھر کھڑے ہوتے ہیں۔"

نئے گاہک کی دم خوب اندر چوتڑوں میں گھس گئی اور وہ چپ چاپ سڑک پار کر گیا۔

بابو نے اپنے آپ کو پھلا کر' منڈیر منڈیر اتراتے پٹھے جیسی پھڑ پھڑی لی۔

"سالہ مجھے بھڑوا سمجھتا ہے! میری پاکٹ میں پورے تین دن کا راشن رکھا ہے...... میں تم جیسے دس بے غیرتوں کے منہ پر بیس بار تھوک سکتا ہوں۔"

وہ لڑکھڑاتا' جھولتا سڑک تک آیا اور بجلی کے روشن کھمبے کا سہارا لیکر سنبھل گیا۔

نشے کی تند ہروں کے درمیان ایک وقفہ سا آیا۔ اچانک اردگرد کی دنیا دھندلی دھندلی سی جی اٹھی۔

عین اس کے سامنے ایک خارش زدہ کتا اسے عجیب سے نظروں سے گھور رہا تھا۔

ایک لمحے کے لئے دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں۔ کتے نے اپنا پچھلا پاؤں اٹھا کر بڑی بے اعتنائی سے کان کھجایا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔

"سالا...... کھمبا خالی ہوتا تو یہی ٹانگ اٹھا کر اپنا کام کر جاتا...... ہا...... ہا...... ہا......"

اچانک سنجیدگی نے اسے گلے سے دبوچ لیا...... اس کے قہقہے سسکیوں میں بدل گئے۔

"آجا بھائی...... آجا...... میں نے تیری جگہ خالی کر دی ہے۔"

کتا ایک لمحے کو رکا' پلٹ کر ایک نظر بابو پر ڈالی اور چلتا بنا' اندھیرے نے اسے نگل لیا۔

"ذلیل' کمینے' کتے......"

اس کی آواز حلق میں الجھ گئی اور اس کے پھیپھڑے احتجاجاً کھانسنے لگے۔

رکشے کی پھٹی آواز اسے اور نیچے لے آئی...... اس نے لمبا ہاتھ ہوا میں اٹھا دیا۔

"صاحب کہاں چلوگے ؟"

"تم کون ہو پوچھنے والے ؟ جیب میں مال ہے' جدھر چاہیں گے چلیں گے۔"

بابو نے نوٹوں کی گڈی نکال کر لہرائی۔

رکشا ڈرائیور نے کھل کر قہقہہ لگایا۔

"سیٹھ رکشا تمہارا ہے...... جہنم کہوگے تو وہاں بھی لے چلونگا۔"

"ہا...... ہا...... ہا...... جہنم...... ٹھیک ہے' چلو وہیں چلتے ہیں۔"

وہ رکشا کمپاؤنڈ کے اندر عین فلیٹ کی سیڑھیوں تک لے گیا۔

منی نے دروازہ کھولا...... اندر سے کولون اور مصالحے کی تیز خوشبو کے بھبھکے اس پر حملہ آور ہوئے' اسے ایک بار پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔

شکر ہے اس گھر میں سے بھی خوشبوئیں آنے لگی ہیں...... لا برا نہ ماننا' تم بالکل بزدل نکلے۔ ذرا سی بات دل پر لیکر قبر میں جا بیٹھے...... اچھا آرام سے سوتے رہو' میں نے سب سنبھال لیا ہے' منی خوش ہے...... میں اس کی شادی اس دھوم دھام سے کرونگا کہ تیری

تاریک قبر جگمگا اٹھے گی۔

'اس نے ایک نظر منی کو دیکھا اور پھر دیکھتا ہی چلا گیا۔

منی ایک دم بدل گئی ہے! اس کی آنکھوں میں' پورے جسم میں عورت اتر آئی ہے۔

کیا سوکھی سڑی، پچکی پچکی ہوا کرتی تھی۔

اس نے جلدی سے آنکھیں جھکا لیں۔

منی واپس جانے کو مڑی تو جھکی آنکھوں کے باوجود اس کے کولھے دھم دھم بابو کے سینے پر بجنے لگتے۔

وہ بوجھل سر کو پٹخنے لگا۔

گہرے سرخ، نتھرے گھی کی جھیل میں تیرتے کوفتے ننگے ننگے سے لگ رہے تھے۔

منی پسار امار کر قالین پر بیٹھ گئی۔

بابو سے برداشت نہ ہوا۔

"جا۔ منی...... میں کھانے سے پہلے کپڑے بدلونگا۔"

منی دھپ دھپ بجتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

بابو نے ٹانگوں اور کمر پر مڑی جینز اتار کر پلنگ کے سرہانے ٹھکتی دھوتی کھینچ لی...... پھر کوفتوں پر ٹوٹ پڑا۔

منی کے ہاتھ میں بھی رونق آگئی ہے۔ مصالحہ پانی ہمیشہ ایک دوسرے سے روٹھے روٹھے' الگ الگ ہوا کرتے تھے۔

اس نے آواز لگائی

"منی برتن لے لو۔"

وہ منی کے آنے سے پہلے آنکھیں میچ کر لیٹ گیا' لیٹا رہا...... جب منی کی جاتی آہٹیں خاموش ہوگئیں تو وہ اٹھ بیٹھا۔

اس نے قمیض کی جیب سے بڑی احتیاط سے پڑیا نکالی...... دوسری جیب سے گولڈ

لیف کی مضبوط' لشکارے مارتی سنہری پنی' تکیے کے نیچے سے موم بتی کا ٹکڑا..... پھیپھڑے اور کمرہ میٹھے میٹھے زہر سے بھرنے لگے۔ وہ واپس بستر پر لیٹ گیا۔

فوم کے گدے پر سونے کا مزہ ہی الگ ہے' ہمیں تو کبھی ڈھنگ کی پٹھے کی چارپائی بھی نصیب نہ ہوئی۔ نشے کی لہریں آسمان سے اونچی اور زلزلے سے زیادہ شوریدہ سر ہونے لگیں۔

اس کی بند آنکھوں میں' اندر ہی اندر' بار بار چلنے والی گھس پٹی بلیک اینڈ وائٹ فلم چلنے لگی۔

لبا منہ اندھیرے بدبودار میلی چٹائی سے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ سرہانے رکھی کورے لٹھے کی صدری ہلکے سے جھاڑ کر پہنتا ہے۔ جیب سے سینکڑوں ہاتھوں کی میل چاٹے' مسکے ہوئے چھوٹے بڑے نوٹ نکال کر' انگلی کو تھوک لگا لگا کر گنتا ہے..... پھر باہر تنگ' چپ چپ کرتی گلی میں لکڑی کا بھاری ٹھیلا چوں چیں کرتا اپنے روز کے لمبے' تھکا دینے والے سفر پر چل پڑتا ہے..... گھر میں بچی کھچی' بیوہ سبزیاں ابل رہی ہیں۔ گوبھی اور بینگن نہ چاہتے ہوئے بھی ایکدوسرے سے گلے مل گئے ہیں۔ منی اور لبا سوکھی گیلی جھاڑیوں میں سر دیئے' ناک سڑاتے گیلے دھوئیں میں پھونکیں مار مار کر نڈھال ہو رہے ہیں۔

اب اسی ٹھیلے پر لبا کی لاش آ رہی ہیں۔

لبا نے تمام عمر سبزی میں گزاری تھی' اس کے باوجود وہ بھنڈیوں' کھیروں اور لوکی کے درمیان لیٹا بالکل اجنبی لگ رہا ہے۔

مسلسل بھاری مشقت اور اماں کا غم لبا کو لے بیٹھا۔

اس کے اندر ایک لجلجہ خدشہ' سر جھلا جھلا کر' آنکھ مار مار کر اپنی انگشت شہادت اس کی سینے میں بھونکتا رہتا ہے..... تم..... تم..... تم......"

لبا نے اس صبح بھی حسب معمول اپنی صدری پہنی اور نوٹ گننے شروع کیئے...... وہ بند آنکھوں سے لبا کے چہرے پر پھیلتی سکڑتی گہری جھریوں کی تہوں کو محسوس کر رہا تھا..... پھر تیز خنجر سیدھا اس کے کلیجے میں اتر گیا۔

"سو کا نوٹ کہاں ہے؟"

وہ سوتا بنا رہا...... لبا کی لوہے کی لٹھ لات اس کی پسلیوں میں پڑی۔

اس نے جھٹ سے اپنا ادھڑا تکیہ اٹھایا اور نوٹ لبا کے ہاتھ میں دے دیا۔

اندر باہر ابھی تک مکمل طور پر تاریکی کا راج تھا...... اسکے باوجود اس نے لبا کی آنکھوں میں اپنی کفنائی لاش دیکھ لی تھی۔

اس نے سب سے پہلے لبا کی لاش کی صدری اتاری اور اندر لے جا کر جلدی جلدی اس کی جیبیں ٹٹولیں...... کوئی اور زیادہ ضرورت مند کام کر گیا تھا۔

لاش ایدھی والوں نے دفنائی۔

قبرستان میں ہی اسکے اندر لاکھوں کروڑوں چیونٹیاں بھوکے منہ کھولے' اندھا دھند دوڑنے لگی تھیں...... گھر پہنچتے پہنچتے ان کی ضرورت اور بوکھلاہٹ پاگل ہو گئی۔

منی ایک کونے میں بدرنگ' بے ہنگم گٹھڑی کی طرح چٹائی پر سمٹی پڑی تھی...... اس کی پھولی پلکوں پر تازہ آنسوؤں کی پھسلن تھی۔

بابو کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

پھر اندھی' پاگل چیونٹیاں اس کا گوشت نوچنے لگیں۔

وہ دبے پاؤں چھتی' کی طرف بڑھا......

منی بے چین نیند میں کسمائی...... بابو کا چھتی کی طرف بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا۔

وہ لبا کی موت پر اس کی تجہیز و تکفین پر ایک آنسو نہ رویا تھا...... اب اچانک اسکے سوتے ہرے ہو گئے اور کئی دریاؤں کے بند ایک ساتھ ٹوٹ گئے۔

منی جاگ اٹھی اور اسے روتے پا کر اس کے سینے میں سمٹ گئی دونوں ٹوٹ ٹوٹ کر بلکتے رہے۔

اندھیرا اترنے لگا تھا۔ منی نے لالٹین روشن کر دی' اندھیرا اب بھی کم ہو کر نہ دیا۔

اچانک منی بلبلا اٹھی۔

"بھائی ہمارا کیا بنے گا؟"

بابو نے اپنا لرزتا ہاتھ منی کے سر پر رکھ دیا...... اس کی آنکھیں چھتی پر رکھی گولک پر جمی تھیں۔

"تو فکر نہ کر...... تیرا بھائی ابھی زندی ہے۔"

پاگل چیونٹیاں نسوں میں ٹکریں مارنے لگی تھیں۔

"منی...... تیرے پاس کچھ پیسے ہیں؟ بھوک لگی ہے"

اس کی آنکھیں گولک کے اندر سکے گن رہی تھیں۔

منی گولک اتار لائی اور دھپ سے فرش پر توڑ دی۔ سکوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر لگ گیا۔

ایک سکہ کنارے پر چلتا خاصا دور نکل گیا۔

بابو رات کو بہت دیر سے لوٹا...... منی ابھی تک جاگ رہی تھی۔

اس کے اندر چیونٹیاں بڑی گہری، میٹھی نیند سو رہی تھیں...... وہ لڑکھڑا کر جھلنگا چارپائی پر گر گیا۔

منی نے اس کی روح کو دہکتی ہوئی چٹکی میں پکڑ کر مسل ڈالا۔

"بھائی مجھے بھوک لگی ہے۔"

اس کے نیم مردہ جسم کے اوپر سے روڈ رولروں کی ایک لمبی قطار گزرتی چلی گئی۔

وہ گرتا پڑتا، سہارے ڈھونڈتا باہر نکلا اور ساتھ والی جھگی پر صدا لگائی۔

پڑوسن چچی بے وقت بھکاری کو کوسنے دیتی باہر آئی لیکن بابو کو دیکھ کر پگھلی موم کی طرح بہہ نکلی۔

وہ تھل تھل کرتی جسم کے حصے سنبھالتی اندر بھاگی اور جو کچھ چار کھا تھا اٹھا لائی، تازہ موت والا گھر دشمنوں کی ہمدردیاں بھی سمیٹ لیتا ہے۔

'منی کا پیٹ بھر گیا ہے اب کوئی غم نہیں ہے'

اور وہ موت سے زیادہ گہری نیند میں اتر گیا۔

پھر وہ ایک دن سیاہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا...... ایک بنگلے کے عین سامنے کھڑی

گاڑی سے ٹیپ ریکارڈ نکال رہا تھا۔

سیٹھ بڑا ہی نرم دل نکلا' اسے نہ صرف نوکروں کے تھپڑوں گھونسوں سے بچایا بلکہ اسے اندر ٹھنڈے کمرے میں لے گیا...... اس کی کہانی سن کر اسکے لئے گرم گرم چائے اور نرم نرم بسکٹ منگوائے۔

"تمہاری بہن کی عمر کیا ہے؟"

"جی...... ابھی سولہواں لگا ہے' بالکل بچی ہے"

سیٹھ کے اندر سے ایک گہری دردناک آہ نکل گئی۔ کمرے میں ہر طرف دکھ پھیل گیا۔

"بابو...... تم اپنے سارے دکھ مجھے دے دو۔"

بابو نے آنکھیں بند کر کے جلدی سے اپنی جھولی جھاڑ دی۔

بابو اور منی نئے فلیٹ میں 'نئی بستی میں شفٹ ہو گئے۔

سیٹھ رشید کے ساتھ نئے فوم کے بیڈ آ گئے' منی کے لئے نئے نئے کپڑے اور سینٹ کولون آنے لگے اور بابو کے اندر چیونٹیاں مطمئن آرام دہ زندگی بسر کرنے لگیں۔

چند دن منی کچھ چپ چپ' حیران حیران سی رہی' اچانک سامنا ہونے پر آنکھیں چرا لیتی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے ہونٹوں پر دہکتی لپ سٹک مچلنے لگی اور اس کی آنکھوں کا دمدار کاجل بولنے لگا۔

شروع شروع میں شیخ رشید روزانہ آتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پھلوں کا لفافہ اور دوسرے میں مٹھائی کا ڈبا ہوتا تھا۔ نیا نیا چاؤ تھا۔ بیوی بچوں والا استعمال شدہ' ادھیڑ عمر آدمی کب تک نئے چاؤ نبھاتا...... اب وہ صرف جمعرات کی شام کو آتا' جیسی تیسی رات گزار کر دوسرے دن صبح کی اذان سے بیشتر اپنے سوئے گھر میں بیوی بچوں میں پہنچ جاتا۔

بابو کو اب صرف اور صرف منی کے بیاہ کی فکر تھی۔ شیخ رشید سے وہ مایوس ہو چکا تھا۔

"مردار صرف تنگ دستی میں حلال ہے' ہمیشہ نہیں" اور اب وہ تنگ دست نہیں

رہنا چاہتا تھا۔

اسے اس خاص ہوٹل کا پتہ چل گیا تھا۔

سرِ شام سرخ نئی دیوار کے ساتھ، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ گاڑیاں رکتی تھیں اور دنیا کا سب سے پرانا کاروبار چلنے لگتا تھا۔

بابو کو ان لوگوں سے گھن آتی تھی۔ وہ ہمیشہ ان سے الگ سڑک کی دوسری طرف کھڑا ہوتا تھا

وہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ پوری خوراک کے باوجود اس کے اندر کی چیونٹیاں گہری نیند سونے کی بجائے کسمسا رہی تھیں۔

'پڑیا بھی سیٹھ رسید کی طرح حرام خور ہے...... اس میں ملاوٹ ہے۔'

بد معاش، پیدل گاہک اور کالا کتا ابھی تک اس کے اندر پوری بے رحمی اور کمینگی سے دندنا رہے تھے۔

اس نے نئی پڑیا نکالی اور پھیپھڑوں کے ہونٹ اس کے دھوئیں پر جما دیئے۔

پھر اچانک ڈھولک بجنے لگی، مہندی میں رچے ہاتھوں کی تھاپ خوشبو بن کر بکھرنے لگی، کنواری آوازیں تپتے خشک ہونٹوں پر مچلنے لگیں۔

منی کے بجتے کولہے، کولون کی خوشبو۔ نتھرے سرخ گھی کی جھیل میں تیرتے کوفتے......

منی کا دولہا طرہ والی پگڑی سجائے، گلابوں میں سجا چلا آرہا تھا...... مہکتی سیج اس کی منتظر تھی۔

"منی کہاں ہو؟ جلدی آؤ...... تمہارا دولہا آگیا ہے۔"

منی چھم چھم کرتی، دہکتے آگ لباس میں بیر بہوٹی بنی اندر چلی آئی...... جگ مگ کرتی سیج نے اسے نگل لیا۔

تیز روشن بلب کے باوجود کمرے میں مکمل تاریکی تھی۔

باڑھ

دفتر میں اندر ہی اندر بڑی گہری گاڑی کھچڑی پک رہی تھی...... ہنڈیا کا ڈھکن بڑا
ٹائٹ تھا...... کچھ باہر آ کر نہ دے رہا تھا۔

میری ناک کے سارے سکشن پمپ (SUCTION PUMP) کھلے تھے......

ایک بوڑھی سرنگ سے جلنے کڑھنے کی کڑوی بو کا بھبکا لپکا...... میں وہیں چپک گیا۔

محکمہ تعلیم سترہ گریڈ کے کچھ سینئر افسران کو مشرقی پاکستان بھیج رہا تھا...... تاکہ
وہاں کی خصوصاً دیہی آبادی کے ہیڈ ماسٹروں کو ایڈ منسٹریشن کے جدید گر سکھائے جا سکیں۔

کسی دل جلے کی بے تکی پبھتی لگی...... بڑے گریڈوں کے سنہرے ہاتھوں ایسی
چھوٹی پالیسی کیسے بن سکتی ہے۔

عمر بھر کی رگڑائی گھسائی کے بعد اگر کوئی "چھوٹا" سترہ گریڈ کی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے
تو دوسری طرف ریٹائرمنٹ کی گہری کھائی تیار ہوتی ہے۔ دورے مزے ہماری قسمت میں
کہاں۔ وہ تو بڑے صاحبان اوپر سے لکھوا کر لاتے ہیں۔

بہر حال ان انہونیوں کے دیس میں کبھی کبھار انہونا بھی ہو سکتا ہے۔

خواب نہ ہوتے تو ہر ذی روح ہوش و حواس کے ناخن آتے ہی سب سے پہلے درخت کے گلے میں پھندا ڈال کر لٹک جاتا...... ہم سب خوابوں پر ہی زندگی کے دن کاٹتے ہیں۔

مشرقی پاکستان...... جادوئی سرزمین...... سرسراتی کھنکتی ندیاں' سر دھنتے دریا اور مہکتے سبزدار...... اور لمبے بالوں' چمکتی آنکھوں والی پریاں......

اکثر ایک شعلہ سا لپکتا تھا...... پھر معاشی صحرا کی ٹھنڈی ریت میں دفن ہو جاتا تھا۔

میں سرکاری خرچے پر ایک دن نہیں' دو دن نہیں' پورا ایک ہفتہ بنگال میں گزار سکتا ہوں۔

میں نے جلدی جلدی ذہن میں ان عزیز رشتے داروں کی فہرست ترتیب دی جو زندگی کی پلک جھپک میں مجھے پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل گئے تھے۔

میں نے ذلت کی متعفن ٹوکری سر پر رکھی...... آنکھوں' ناک' کانوں میں بے غیرتی ٹھونسی اور دروازے دروازے خون کے رشتوں کے بین کرتا پھرا۔

ایک جگہ...... صرف ایک جگہ فرعونیت کی برف میں ایک دراڑ پڑی...... شاید! دل مطمئن ہو کر نہ دے رہا تھا۔

کئی راتیں بستر کا شا رہا...... گندے نظام پر تھوکتے تھوکتے حلق جل گیا۔

فہرست آئی اور اس میں اپنا نام دیکھ کر پھر سے خون کے رشتوں کی عظمت کا یقین ہو گیا۔

پہلی بار ہوائی جہاز کی خدائی سواری پر سفر کا موقع مل رہا تھا۔

لاؤنج میں گردن دو گریڈ تن گئی...... اور جہاز کے اندر پہنچنے پر گریڈوں کی تنگی داماں کا شدت سے احساس ہوا۔

ٹائی سوٹ ایک بار شادی پر پہنا تھا اور دوسری بار اب...... دونوں مواقع پر گلہ گھٹتا رہا...... احتجاج کرتا رہا...... لیکن کسے پروا تھی۔

ڈھاکہ ایئر پورٹ پر اپنے محکمے کی گاڑی لینے آئی تھی ...... ڈرائیور گلے میں میرے نام کا پٹہ پہنے کھڑا تھا۔

شدید مایوسی ہوئی ...... کتنے بے حس اور متعصب لوگ ہیں۔

دوپہر کا کھانا ایک مقامی اسکول میں رکھا گیا تھا۔

چھوٹے چھوٹے' سانولے ...... کپڑے تک ڈھنگ سے پہننے کا شعور نہ تھا ...... ایک کی ٹائی کی گرہ آدھی سے زیادہ کالر کے نیچے گھسی تھی ...... انگریزی اردو بولتے تو ہنسی کے ساتھ رونا بھی آتا ......

کھانے سے پہلے میں نے کوئی گھنٹہ بھر لمبی تقریر کر ڈالی۔

ہر کوئی سراپا آنکھ کان ایک ایک حرف دل میں اتار رہا تھا ...... مجھے زندگی میں پہلی بار اپنی اہمیت کا احساس ہوا ...... اسلام آباد میں ضائع ہو رہا تھا ...... بلکہ ہو چکا تھا۔

سہ پہر محکمے کی گاڑی روتی دھوتی ایک گاؤں نما قصبے میں لے آئی۔

اسکول کا ہیڈ ماسٹر دھوتی ٹھیک کرتا' دوڑتا باہر نکلا اور بے تکلفی سے گلے ملنے کی کوشش کی ...... میں نے ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا۔

ہیڈ ماسٹر کے سرکاری کوارٹر سے ملحق ایک چھوٹا سا گیسٹ روم میرے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔

میں نے پہلی ہی نظر میں اس فاقہ زدہ کمرے کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔

ہیڈ ماسٹر سخت پریشان ہو گیا ...... اسے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ ان حالات میں کیا کرے۔

"آس پاس کوئی سرکاری گیسٹ ہاؤس ہے ؟"

ہیڈ ماسٹر کی پریشانی اطمینان میں بدلنے لگی ...... پھر اس نے پورا منہ کھول کر قہقہہ لگایا ...... باسی مچھلی کی بساندھ کا ایک غبار مجھ پر حملہ آور ہوا اور میں کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

وہ مجھے ساتھ لئے اسکول کی عمارت کی طرف آیا اور اپنا دفتر کھول کر فون کے نمبر ڈائل کئے۔

چند لمحے بے ربط ہاؤ ہو کے بعد اس نے فون رکھ دیا...... اور انتہائی خوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے مبارک باد پیش کی۔

"ڈی سی صاحب کا پی اے میرا شاگرد رہ چکا ہے...... بندوبست ہو جائے گا۔"

مجھے لانے والی گاڑی ابھی تک کھڑی تھی...... سامان میں نے اترنے نہ دیا تھا۔

ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے اور پلک جھپکنے میں گیسٹ ہاؤس میں پہنچ گئے۔

ناریل اور کیلے کے لمبے جھومتے پتوں کے پیچھے آنکھ مچولی کھیلتا انگریزی دور کا سرخ اینٹوں کی چھت والا گیسٹ ہاؤس...... نزدیک ہی اونگھتا ہوا چوڑا چکلہ دریا...... دریا میں تیرتی ہوئی رنگ برنگی کشتیاں...... یہ جگہ واقعی میرے شایان شایاں تھی۔

ہیڈ ماسٹر کا سابقہ شاگرد اپنی مریل سائیکل کا ہینڈل تھامے منتظر کھڑا تھا...... مجھے دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل ابھر آئے۔

اس نے سائیکل درخت کے تنے کے ساتھ لگائی اور ہیڈ ماسٹر کے پاؤں چھونے لپکا۔

میرے اندر نفرت کے الاؤ ابل پڑے۔

'ہر جگہ ہندو چھاپ......'

اس کی آنکھیں میری طرف اٹھیں تو اس نے فوراً منہ پھیر لیا۔

میں نے ہیڈ ماسٹر کو مخاطب کیا۔

"کھانے وغیرہ کا کیا انتظام ہو گا؟"

ہیڈ ماسٹر نے پلٹ کر اپنے شاگرد کی طرف دیکھا۔

"چوکیدار کی بیوہ کو اطلاع کر دو نگا...... ادھر بنگلوں میں ہوٹل بھی ہے۔"

اس کے لہجے میں چھیل دینے والا کھردراپن تھا۔

ہیڈ ماسٹر نے جھک کر مجھ سے ہاتھ ملایا...... اس کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

ہیڈ ماسٹر کا شاگرد مجھ سے ہاتھ ملائے بغیر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

دونوں کے سر ہل رہے تھے...... ہاتھ اچھل کود رہے تھے...... ہیڈ ماسٹر کی حرکات

میں نرمی تھی' انداز سمجھانے والا تھا...... نوجوان کی ہر ادا برہم تھی' سرکش تھی۔

میرا بس چلتا تو ابھی اس وقت اس کا سر کچل دیتا۔

درختوں کی اوٹ سے ایک سیاہ بھجنگ جسم پھدکتا ہوا آیا اور میرے قریب ایک کرسی رکھ دی...... اس کے جسم پر صرف ایک دھوتی تھی جو بمشکل ستر کی شرعی حدود کو پورا کر رہی تھی۔

میں نے اس سے بات کرنا چاہی تو وہ کافی دیر تک بنگالی میں اچھلتا کودتا رہا...... پھر خاموش ہو کر میرا چہرہ پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

'اتنا عرصہ گزر گیا ہے اور ان لوگوں نے قومی زبان سیکھنے کی کوشش نہیں کی...... انہیں ملک سے......'

اب میری کھوپڑی میں دو بھڑیں دائروں میں چکر کاٹنے لگیں۔

'ہیڈ ماسٹر مجھے یہاں پھینک کر بھاگ نکلا ہے...... گاڑی ساتھ لے گیا ہے...... روزانہ لیکچر کے لئے اسکول کیسے پہنچا جائے گا...... اور کھانے پینے کا انتظام......'

'رکشا......!'

میرے اندر دبی انسانیت اچانک قے کرنے لگی۔

'انسان' انسان کو جانور کی طرح کھینچتا پھرے!'

میں نے پہلی بھڑ سے نجات حاصل کر لی۔

'پیدل اٹھ دس منٹ کا راستہ ہوگا...... اور پھر چاروں طرف پھیلا فطرت کا حسن...... پتا بھی نہ چلا کرے گا۔'

ہیڈ ماسٹر کا شاگرد سر پھرا باغی لگتا ہے...... ناشتے چائے کیلئے کسی کو بھیجے نہ بھیجے...... اور یہ گونگا لڑکا کس کام کا۔

لکڑی کا پرانا بھاری گیٹ چرچرایا اور ایک جھجکتا ہوا سایہ درختوں کے سائے میں سرکتا میری طرف بڑھنے لگا۔

"صاحب جی...... میں پرانے چوکیدار کی بیوہ ہوں۔"

بنگالی منہ میں پھڑکتی اردو سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔

اسپتال کی پٹیوں والی چھدری، فحش ململ سے ملتے جلتے کپڑے کی نابالغ ساڑھی اسکے اندر ایک خزاں کا مارا گہرا سانولا جسم اور فاقہ زدہ بھینس جیسی پھٹی پھٹی آنکھیں

میرے اندر ایک تلخ، طنز میں لتھڑا قہقہہ بڑبڑا اٹھا۔

"سحر بنگال......"

میں نے اس جسم سے لاتعداد سالوں کی مٹی جھٹکی...... کوئی خاص فرق نظر نہ آیا۔

"اس وقت بس چائے کا ایک کپ بنا دو...... کوئی دوکان ہے آس پاس؟"

"جی صاحب...... ادھر بنگلوں میں کئی دوکانیں ہیں...... بندو سامان لے آئے گا۔"

"بندو" اچھلا اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔

میں نے اسے کچھ رقم دی...... اور وہ باہر کو جھاگ نکلا۔

مجھے شک سا ہوا کہ وہ اردو سمجھتا ہے اور شاید بول بھی سکتا ہے۔

میں نے مسائل سے فراغت پا کر اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

میرے اوپر پرندوں کے غبار تھکے پروں گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے...... دریا گیلی معطر شام اوڑھ کر سونے کی تیاریاں کر رہا تھا...... تیزی سے بڑھتی تاریکی میں اس کی غصیلی غراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔

چوکیدار کی بیوی صاف ستھرے ٹرے میں چائے سجا کر لے آئی۔

اس دوران بندو اندر سے ایک میز لا کر میرے سامنے رکھ چکا تھا۔

چائے اچھی تھی...... بالکل اپنا اسٹائل...... تقریباً دودھ پتی

میں نے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ذرا سوشل ہونے کی کوشش کی...... آخر یہ لوگ میرے ہموطن تھے۔

"تمہارا شوہر...... یہاں چوکیدار تھا؟"

"جی صاحب...... پچھلے سال باڑھ میں بہہ گیا تھا...... بندو اس کا چھوٹا بھائی ہے۔"

میں نے چونک کر اس کے چہرے کی سرمائی زردی میں دکھ تلاش کرنے کی

کوشش کی......اس پتھر کے چہرے پر کچھ نہ تھا۔

بیڈروم میں خواب بستر...... آدمی لیٹے تو دفن ہو جائے...... سائڈ ٹیبل اور ان پر رنگین اونٹ کی کھال کے ملتانی لیمپ...... غسل خانے کی چمکتی ٹائیلیں...... چلو ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ یاد کرنے اور پوتے پوتیوں کو سنانے کو تو ہو گا۔

ہال میں پندرہ بیس ایک جیسے بدصورت' مدقوق چہرے جمع تھے...... زندگی سے بیزار......نہ کوئی جذبہ نہ جوش......

کوئی گھنٹہ بھر دیر سے آنے والوں کا سلسلہ جاری رہا...... کسی کی ناؤ دیر سے بھری تھی...... کسی کی سائیکل عین بیچ راستے پنکچر ہو گئی تھی......ایک سے ایک لنجا لولد بہانہ......

میں نے انہیں احساس دلایا کہ میں سب سمجھتا ہوں...... مجھے بیوقوف نہیں بنایا جاسکتا۔

بہر حال فرض پورا کرنا تھا۔

میں نے ایک طویل لیکچر دیا...... سب آنکھیں کان بنے میرا مقدس کلام جذب کر رہے تھے......اور میری ہدایات کے مطابق ساتھ ساتھ نوٹس لے رہے تھے۔

دوپہر کا کھانا اسکول کی طرف سے تھا......میں نے جاننے کی کوشش نہیں کی کہ محکمہ کی طرف سے ہوا کرے گا یا ہیڈ ماسٹر کی تار تار جیب سے کاٹا جایا کرے گا۔

میں نے پانچ پانچ افراد پر مشتمل گروپ تشکیل دیئے اور انہیں بحث مباحثے کے بعد رپورٹ تیار کرنے کی ہدایات دیں۔

میرا کام تقریباً ختم تھا۔

باقی دن وہ میری نگرانی میں رپورٹیں تیار کرتے رہے......میں انہیں اپنے مشوروں اور گائیڈنس سے نوازتا رہا......

وہ لوگ میری موجودگی میں بھی آپس میں بنگالی میں گفتگو کرنے لگتے تھے......جب میں گھورتا تو جلدی سے ٹوٹی پھوٹی اردو یا پھر انگریزی کی انگلی پکڑ لیتے تھے۔

آخری دن انہیں اپنی اپنی گروپ رپورٹس پیش کرنی تھیں......اور مجھے اپنی رپورٹ

کے ساتھ ان سب کو ڈھاکہ چھوڑنا تھا۔

دریا پر کشتی بانوں اور مسافروں کے شور شرابے اور جھگڑوں کی وجہ سے صبح صبح اٹھ گیا تھا۔

میں آکر لان میں بیٹھ گیا اور چوکیدار کی بیوہ کا انتظار کرنے لگا۔

وہ صبح صبح آکر چائے اور ٹوسٹ سینک دیتی تھی...... انڈے میں نے ایک عرصے سے کولیسٹرول کے خطرے سے چھوڑ رکھے تھے۔

شام کو میں ٹہلتا ہوا پیچھے بنگلوں کی طرف نکل لیتا اور وہیں صاف ستھرے ہوٹل میں رات کا کھانا کھا کر آتا تھا۔

اس طرف تقریباً ساری آبادی غیر بنگالی تھی...... کسی نہ کسی ہم زبان سے گفتگو ہو جاتی...... یہ بھی اچھا تھا ورنہ میں گونگا بہرہ ہو کر وطن لوٹتا۔

میں لان میں بیٹھا ٹوٹی ٹوٹی نشئی جمائیاں لے رہا تھا...... چوکیدار کی بیوہ ابھی تک نہ آئی تھی۔

وہ روزانہ میرے اٹھنے سے پہلے آجاتی تھی اور میری پہلی آواز پر چائے کا کپ آجاتا تھا۔

میں نے بندو کو آوازیں دیں۔

بندو رات کو یہیں سوتا تھا اور ہر وقت، ہر جگہ موجود ہوتا تھا۔

بندو غائب تھا۔

میں نے بڑبڑاتے ہوئے تیاری شروع کر دی...... آج بنگال کی سرزمین پر میرا آخری دن تھا۔

تیار ہو کر باہر آیا...... بندو اور چوکیدار کی بیوہ ابھی تک لاپتہ تھے۔

صبح کی چائے کا نشئی جسم بلبلانے لگا تھا۔

'بھاڑ میں جائے سب کچھ......'

میں ابلتا ہوا گیٹ کی طرف چل پڑا۔

چوکیدار کی بیوہ دوڑتی، ہانپتی چلی آ رہی تھی۔

اس نے سانس قابو میں آنے کا بھی انتظار نہ کیا...... اسکے دونوں ہاتھ جڑ گئے۔

"صاحب معافی...... دیر ہو گئی۔ میرا چھوٹا بیٹا میرے پیچھے بھاگا...... ناؤ چل پڑی...... وہ میرے پیچھے دریا میں کود گیا۔"

وہ دم بھر کے لئے رکی...... ایک چھوٹی سی سانس اندر کھینچی۔

"لاش مل گئی ہے...... میں نے سوچا پہلے آپ کو چائے دے آؤں...... بندو بھی ادھر ہے......"

میں نے اسکے چہرے پر غم تلاش کرنے کی کوشش کی...... سرمئی زرد پتھر کے چہرے پر کچھ بھی نہ تھا۔

'سالی...... جھوٹ بول رہی ہے...... مجھے احمق سمجھتی ہے۔'

میں نے رعونت سے اپنی سریا گردن کو جھٹکا دیا اور گیٹ سے باہر نکل آیا۔

دریا گرج رہا تھا...... اسکی سطح پر تیرتی کشتیوں کے بادبان بری طرح پھڑ پھڑا رہے تھے......اور درختوں میں چھپے پرندوں کی چیخ و پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔

میں خراماں خراماں چلتا، فطرت کے حسن کو جذب کرتا چلتا رہا۔

واپسی وطن لوٹ کر جب بھی میں عزیزوں، رشتے داروں اور دفتر کے ساتھیوں کو بنگال کے قصے سناتا تو ہر طرف احساس برتری کی پھلجھڑیوں سے پھول برسنے لگتے...... میری ہنسی کی آواز سب سے اونچی ہوتی تھی۔

اور اب!

مصنف کی دیگر تخلیقات

۱۔ گرم ریت (افسانوی مجموعہ)

۲۔ جزیوں کا رقص (افسانوی مجموعہ)

۳۔ شہر جنگل (افسانوی مجموعہ) زیر طبع

۴۔ برہنہ لوگ (افسانوی مجموعہ) زیر طبع

آپ کی بیشتر کہانیاں realiable ہیں۔ یعنی ان میں وہ کہانی پن موجود ہے جو ایک قاری کو کہانی پڑھنے پر اکساتا ہے۔ آپ کی زیادہ تر کہانیاں نہ معمہ ہیں اور نہ وعظ ہیں۔ وہ تو بس کہانیاں ہیں۔ اور یہ بات ایک ایسے دور میں بڑی بات ہے جہاں افسانے اور ناول کے نام پر عجیب و غریب، بے معنی اور لایعنی تحریریں سامنے آرہی ہیں۔ سو آپ اس امتحان میں کامیاب ہیں کہ آپ نے جو کہا وہ پڑھنے والے تک پہنچ گیا ہے۔

آپ کی کہانیوں کی ایک خوبی جس نے مجھے متاثر کیا وہ یہ ہے کہ آپ نے بہت چھوٹے چھوٹے مکمل جملوں سے کہانیوں کی بنت کی ہے۔ اس میں اکثر جملے مکالماتی ہیں۔ Moulogue یا Dialogue مگر وہ اسی طرح کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں، جیسے قطب مینار کی سیڑھیاں بلندی کی طرف لے جاتی ہیں۔ پس جس چیز نے مجھے آپ کی Craftsmenship نے پکڑ لیا، وہ یہی تھی۔ آپ کی عبارت اور بیان میں جھول یا inactivity نہیں ہے۔ اس طرح آپ نے اپنی گرفت بڑی مضبوط رکھی ہے۔

(ایک قاری)